سوویت یونین کے انہدام

سوشلزم کی ناکامی؟؟

ترتیب وتحقیق: حنازین

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2001-2006

سوشلزم

50 سوال اور ان کے جوابات

سوالات

1- کمیونزم کیا ہے؟

2- پرولتاریہ کیا ہے؟

3- کیا پرولتاریہ کا وجود ہمیشہ سے تھا؟

4- پرولتاریہ کا جنم کیسے ہوا؟

5- وہ کون سے حالات ہوتے ہیں کہ پرولتاریہ اپنی قوت محنت بورژوا طبقے کے پاس بیچنے پر مجبور ہو جاتا ہے؟

6- صنعتی انقلاب سے پہلے محنت کش طبقے کی کیا شکل تھی؟

7- پرولتاریہ غلاموں سے کن بنیادوں پر مختلف ہے؟

8- پرولتاریہ کن بنیادوں پر مزارع سے مختلف ہوتا ہے؟

9- وہ کون سے حالات ہوتے ہیں جو پرولتاریہ کو دست کار سے جدا کرتے ہیں؟

10- پرولتاریہ کن بنیادوں پر گھریلو دستکار یا چھوٹے پیمانے کی صنعت کے محنت کش سے مختلف ہوتا ہے؟

11- وہ کیا حالات تھے کہ صنعتی انقلاب رونما ہونے کے باعث معاشرہ بورژوا اور

پرولتاریہ طبقات میں بٹ گیا؟

12- صنعتی انقلاب کے مزید کیا اثرات رونما ہوئے؟

13- ان بار بار (دوری) کے تجارتی بحرانوں سے کیا نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں؟

14- یہ نیا سماجی نظام کس قسم کا ہوگا؟

15- کیا اس سے قبل نجی ملکیت کا خاتمہ ناممکن تھا؟

16- کیا پرامن طریقہ کار سے نجی ملکیت کا انسداد ممکن ہے؟

17- اس انقلاب کا طریقہ، انداز یا راستہ کیا ہوگا؟

18- کیا یہ ممکن ہے کہ یہ انقلاب محض ایک ہی ملک میں رونما ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہو سکے؟

19- نجی ملکیت کے خاتمے کے کیا دور س نتائج برآمد ہونگے؟

20- کمیونسٹ نظام کے خاندان پر کیا اثرات مرتب ہونگے؟

21- قوموں یا قومیتوں کے متعلق کمیونزم کا کیا رویہ ہوگا؟

22- مارکسزم کیا ہے؟

23- مارکس ازم، لینن ازم، اور ٹراٹسکی ازم کیا ہیں؟

24- جمہوریت اور سوشلزم بیک وقت کیسے وجود رکھ سکتے ہیں۔

25- سوشلزم کے تحت پیداوار کو سماجی کیسے بنایا جائے گا اور دولت کی تقسیم کس طرح کی جائے گی؟

26- بیگانگی کیا ہے؟

27- کسی عہد کے حاوی تصورات کیا ہوتے ہیں؟

28- تاریخ میں فرد کا کردار کیا ہے؟

29- سماج کی مادی بنیادیں کیا ہیں؟

30- سماجی ارتقاء کے قوانین کیا ہیں؟

31- سرمایہ دارانہ ارتکاز کا تاریخی رجحان کیا ہے؟

32- گلوبلائزیشن کیا ہے؟

33- غربت اور عدم مساوات میں روز بروز اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟

34- ملٹی نیشنل کمپنیاں اتنی طاقتور کیوں ہیں؟

35- کیا یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری سے لڑے بغیر عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کے خلاف لڑا جائے؟

36- سیاٹل، پراگ، اور ونیس وغیرہ میں مظاہروں کی کیا وجوہات تھیں؟

37- کیا ایک مختلف قسم کے سماج کا قیام ممکن ہے؟

38- لوگوں کی اس سے کیا مراد ہوتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہیں؟

39- کیا یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری سے لڑے بغیر کسی ایک ادارے یا فرد کے خلاف لڑا جائے؟

40- انقلاب کیا ہے؟

41- انقلابی پارٹی کیا ہوتی ہے؟

42- انقلابی پارٹی کیوں ضروری ہوتی ہے؟

43- کمیونسٹ مینی فیسٹو نے سیاسی جدوجہد کے طریقہ ہائے کار کے بارے میں کیا بنیادی اصول پیش کیا تھا؟

44- سوشلزم کے ناگزیر ہونے کے بارے میں مارکس کی کیا رائے تھی؟

45- تاریخ کا مادی تصور کیا ہے؟ (لینن کی وضاحت)

46- مارکسزم کا فلسفہ (جدلیاتی مادیت) کیا ہے؟

47- طبقاتی جدوجہد کیا ہوتی ہے؟

48- مطالعے کے سلسلے میں ٹراٹسکی کا نقطہ نظر کیا تھا؟

49- انقلاب مسلسل کیا ہے؟

50- کیا سوویت یونین کے انہدام سے سوشلزم کی ناکامی ثابت نہیں ہوتی؟

سوال- کمیونزم کیا ہے؟

جواب- پرولتاریہ (محنت کش) کی غیر استحصالی اور غیر طبقاتی سماج کیلئے کی جانے والی جدوجہد اور مارکسی انقلابی نظریے کی بنیاد پر استوار ہونے والے نظام کو کمیونزم کہتے ہیں۔ اس میں دوسرے کا استحصال کرنے والی ملکیت یعنی نجی ملکیت کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ ذرائع پیداوار محنت کش عوام کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔ اس نظام میں ہر ایک سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور اس کی ضرورتوں کے تحت اس کو دیا جاتا ہے۔ ذہنی اور جسمانی محنت میں پائی جانے والی تفریق کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ معاشرے کے ہر فرد کی مانگ یعنی ضروریات بشمول غذا، لباس، رہائش، تعلیم، صحت وغیرہ بلا تخصیص سب کو یکساں بنیادوں پر حاصل ہوتی ہیں۔ اس نظام میں بیروزگاری اور بے کاری کے الفاظ سے عوام نا آشنا ہوتے ہیں۔ بیماری، بھوک، جہالت، غربت اور دیگر تمام سماجی برائیاں جو سرمایہ دارانہ نظام کی دین ہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ آزاد، خوشحال اور حقیقی انسانی سماج درحقیقت اسی نظام میں پنہاں ہے۔

سوال- پرولتاریہ کیا ہے؟

جواب- پرولتاریہ سماج کا وہ طبقہ ہوتا ہے جو ذرائع پیداوار کی ملکیت سے

محروم' اپنی بقاء اور ضروریات زندگی کے حصول کیلئے اپنی قوت محنت بیچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں وہ کسی بھی قسم کے سرمائے' جس کا وہ خالق ہوتا ہے' میں منافع کا قطعی حقدار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ اس کی خوشی وغم' زندگی اور موت غرضیکہ اس کی بقاء کا انحصار محنت کی طلب اچھے یا برے کاروبار اور بے لگام مسابقت کی متلون مزاجی پر ہوتا ہے۔ گویا پرولتاریہ یا پرولتاری طبقہ محنت کش عوام کو کہتے ہیں جو صنعتوں میں جا کر سرمایہ دار کے پاس اپنی قوت محنت بیچتے ہیں۔ یہ اصطلاح 19ویں صدی میں ضبط تحریر میں لائی گئی۔

سوال- کیا پرولتاریہ کا وجود ہمیشہ سے تھا؟

جواب- نہیں' غریب اور محنت کش ہمیشہ سے موجود رہے ہیں اور محنت کش اکثر و بیشتر غریب ہی رہے ہیں۔ پیداواری عمل کے دوران ذرائع پیداوار اور آلات پیداوار پر چند افراد کی ملکیت کے باعث غریب اور محنت کش طبقے کا ظہور ہوا۔ پرولتاریہ صنعتی عہد میں معرض وجود میں آیا۔ لیکن ان کی یہ حالت ازل سے نہیں تھی۔ کیونکہ آزاد اور بے لگام مسابقت بھی ہمیشہ سے موجود نہیں تھی۔

سوال- پرولتاریہ کا جنم کیسے ہوا؟

جواب- پرولتاریہ نے اس صنعتی انقلاب میں جنم لیا جو 18ویں صدی کے وسط میں انگلینڈ میں رونما ہوا اور بعد ازاں دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گیا۔ بھاپ کے انجن کی ایجاد' سپننگ مشین' پاور لوم' اور دوسرے تکنیکی آلہ جات اور مشینیں صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ بنیں۔ ایک تو ایجاد شدہ مشینیں زیادہ لاگت کی حامل تھیں اور انہیں اس وقت صرف بڑے سرمایہ دار ہی تیار کروا اور خرید سکتے تھے۔ ان مشینوں نے قدیم ذرائع پیداوار اور پیداواری عمل کی جگہ لی۔ کھڈی اور چرخہ کے

مقابلے میں سپننگ مشین اور پاور لوم نے زیادہ پیداوار دینا شروع کی تو پرانا نظام بتدریج ختم ہوگیا۔ اگر چہ نئے نظام کی وجہ سے جدت اور پیداوار میں اضافہ ہوا لیکن ان مشینوں پر بورژوا (سرمایہ دار) طبقے کے تصرف کے باعث پوری صنعت سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور محنت کشوں کی معمولی نوعیت کی ملکیت (کھڈی اوراوزار وغیرہ) بے کار ہوگئی۔ اس کے بعد تمام چیزوں اور صنعتی عمل کو سرمایہ داروں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور محنت کشوں کو ہر طرح کے آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار سے محروم کر دیا۔ یوں کھڈی پر بنے جانے والی کپڑے کے نظام کی جگہ ٹیکسٹائل انڈسٹری نے لی اور اس طرح صنعتی نظام کا آغاز ہوا۔

کپڑے کی تیاری میں صنعتی نظام کے آ جانے سے دوسرے شعبوں کی بھی تیزی سے کایا پلٹ گئی اور وہ بھی صنعتی نظام کا حصہ بن گئے۔ جن میں فوری طور پر کتابوں کی پرنٹنگ، پوٹری اور دھات سازی کے کارخانے شامل تھے۔ محنت کو زیادہ سے زیادہ محنت کشوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے ایک ہنر مند کاریگر جو کسی بھی شے کو مکمل طور پر تیار کرنے پر قدرت رکھتا تھا اب محض اس شے کا ایک حصہ تیار کرتا تھا۔ اس سے انفرادی محنت کش کی سرگرمی نہایت سادہ اور لگاتار دہرائی جانے والی میکانکی حرکات تک محدود ہو کر رہ گئی جسے مشین من وعن بلکہ زیادہ بہتر انداز میں سرانجام دے سکتی ہے۔ محنت کی تقسیم کے باعث اشیاء کی تیاری اور ان کی رسد میں تیزی آ گئی اور یہ کم لاگت کے باعث سستی بھی ہوتی گئیں۔ جنہوں نے دست کاری اور انفرادی طور پر تیار کی جانے والی اشیاء کی جگہ لے لی۔ اس طرز پیداوار میں فنی اور تکنیکی صلاحیت اور عمل با آسانی اور تواتر کے ساتھ دہرائے جا سکتے تھے۔ جس کی وجہ سے پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا اور مشینوں کی بدولت اشیاء کے معیار میں بھی

بہتری آئی۔ اس طرح یہ سارا پیداواری عمل صنعتی نظام کے تابع ہو کر رہ گیا اور سپننگ اور ویونگ کا عمل بھاپ کی مشینوں کا مرہون منت ہو گیا۔ تاہم دوسری طرف یہ ساری بڑی صنعتیں بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ اور محنت کشوں کی رہی سہی آزادی یا خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا۔ یوں ہنر مند کاریگر اور مینوفیکچرر صنعتی نظام میں ڈھل گئے اور دست کار چھوٹے مالکان سے بڑے سرمایہ داروں کی شکل اختیار کر گئے۔ انہوں نے بڑی بڑی صنعتیں اور ورکشاپیں بنالیں اور سرمایہ بچانا شروع کر دیا اس طرح تقسیم محنت کا ایک نیا نظام معرض وجود میں آیا۔

اس سارے عمل کے نتیجے میں نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں تمام مزدور محنت فروخت کرنے پر مجبور ہوئے اور دست کاری و مینوفیکچرنگ کے تمام شعبے وسعت اختیار کر کے بڑی صنعت کی شکل اختیار کر گئے۔ اس سارے عمل نے ایک جست لگائی اور چھوٹے دستکاروں و ہنر مندوں سمیت سابقہ مڈل کلاس یا درمیانے طبقے کو روند ڈالا۔ محنت کشوں کی پرانی شکل کی ہیت و کیفیت کو بدل کر رکھ دیا اور یوں معاشرہ دو طبقوں میں بٹ گیا۔ دو نئے طبقات نے جنم لیا۔ جنہوں نے دھیرے دھیرے معاشرے کے دوسرے افراد کو اپنے طبقے یا صفوں میں لا کھڑا کیا۔ یہ طبقات درج ذیل تھے۔

1- بورژوا (سرمایہ دار) طبقہ:

جو تمام ترقی یافتہ ممالک کے ذرائع پیداوار پر قابض ہو گئے اور خام مال و آلات (مشین، فیکٹریاں) جو پیداواری عمل کیلئے ناگزیر تھیں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ طبقہ بورژوا (سرمایہ دار) کہلایا۔

2- پرولتاریہ (محنت کش) طبقہ:

اس طبقہ کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف اپنی قوت محنت بورژوا طبقے کے پاس فروخت کرنے پر مجبور تھے تا کہ اس کے بدلے میں زندہ رہنے کیلئے ضروری لوازمات کا تبادلہ کرسکیں اس طبقے کو پرولتاریہ (محنت کش) طبقہ کہا گیا۔

سوال- وہ کون سے حالات ہوتے ہیں کہ پرولتاریہ اپنی قوت محنت بورژوا طبقے کے پاس بیچنے پر مجبور ہو جاتا ہے؟

جواب- سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کی حیثیت محض ایک جنس کی مانند ہوتی ہے اس کی قدر کا تعین ان قوانین کی بدولت ہی ممکن ہوتا ہے جو دوسری اجناس کیلئے روبہ عمل ہوتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر صنعتی دور یا آزادانہ مقابلے کے عہد میں انسانی محنت اور جنس ایک ہی شے کی مانند ہوتے ہیں۔ کسی بھی جنس کی قیمت کا تعین اس کی پیداوار پر آنے والی لاگت اور گزر بسر کیلئے درکار ضروری لوازمات کی مقدار پر مشتمل ہوتا ہے تا کہ محنت کش کام کاج کے قابل رہیں اور بطور محنت کش طبقے کے ختم نہ ہو جائیں' اور بدلے میں ان کو صرف اتنا ہی معاوضہ دیا جاتا ہے جتنے میں وہ صرف زندہ رہ سکیں۔ اس نظام میں محنت کش طبقے کو زندہ رکھنا اس لئے ضروری ہوتا ہے تا کہ وہ صنعت کو متحرک رکھ سکیں اور سرمایہ دار منافع بٹور سکیں۔ وہ محنت کش کو اس کی خدمات کا معاوضہ زیادہ نہیں دیتے۔ محنت کش کو تنخواہ یا کام کے بدلے میں اجرت اس قدر کم دی جاتی ہے کہ اس کی زندگی کی سانسوں کی بقا ممکن رہ سکے اور وہ اپنی قوت محنت استعمال کر سکے۔ تاہم کاروبار کبھی اچھا ہوتا ہے کبھی خراب۔ محنت کش کو کبھی کم معاوضہ ملتا ہے کبھی زیادہ۔ بالکل اسی طرح محنت کش بھی اس کم از کم اجرت سے کم وصول کرتا ہے اور نہ زیادہ۔ جس طرح فیکٹری کا مالک اچھے اور خراب کاروبار کی

اوسط کی بنیاد پر اپنی اجناس کی پیداواری لاگت سے نہ تو کم وصول کرتا ہے اور نہ ہی زیادہ، اسی طرح محنت کش بھی اس کم از کم اجرت سے نہ تو زیادہ وصول کرے گا اور نہ ہی کم۔ بڑے پیمانے کی صنعت جس قدر زیادہ پیداواری شعبوں پر غالب آتی جائے گی اجرتوں کا یہ معاشی قانون اتنی ہی شدت سے نافذ ہوگا۔ سرمایہ دار کے پاس تو ذرائع پیداوار اور آلات پیداوار ہوتے ہیں۔ جبکہ محنت کش طبقے کے پاس سوائے اپنی قوت محنت بیچنے کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور اسے چاروناچار زندہ رہنے کیلئے اپنے خاندان کی کفالت کیلئے سرمایہ دار کے پاس اپنی قوت محنت بیچنا پڑتی ہے۔

سوال۔ صنعتی انقلاب سے پہلے محنت کش طبقے کی کیا شکل تھی؟

جواب۔ سماجی نشوونما کے مختلف مدارج پر محنت کش طبقات مختلف صورتحال میں رہتے تھے اور ان کے اپنے مالکوں یا حکمران طبقات کے ساتھ تعلقات کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ زمانہ قدیم میں محنت کش لوگ اپنے آقاؤں کے غلام تھے بالکل اسی طرح جیسے آج بھی کئی پسماندہ ممالک میں انسان انسانوں کے غلام ہیں۔ درمیانی دور میں محنت کشوں کی شکل مزارعوں کی تھی جو زمینوں کے مالک، اشرافیہ اور جاگیردار کے تصرف میں تھے اور آج بھی تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں ہیں۔ صنعتی انقلاب کے مکمل طور پر ظہور پذیر ہونے تک وہ کرائے کے ملازم تھے، جو قصبوں میں پیٹی بورژوا کے پاس کام کرتے تھے۔ پھر بتدریج مینوفیکچرنگ نے ترقی کی جس سے ہنرمند کاریگر پیدا ہوا اور بعد ازاں صنعتی عمل میں وہ بڑے سرمایہ داروں کے تصرف میں چلا گیا۔ یوں اس نے صنعتی کارکن یا پرولتاریہ کی شکل اختیار کرلی۔

سوال۔ پرولتاریہ غلاموں سے کن بنیادوں پر مختلف ہے؟

جواب۔ غلام ایک ہی مرتبہ اور ہمیشہ کیلئے فروخت کردیا جاتا تھا۔ پرولتاریہ

بھی اپنے آپ کو بیچتا ہے مگر دنوں یا گھنٹوں کے حساب سے۔ غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔ جو ساری زندگی اس کے پاس رہتا ہے اس کی حالت زندگی کتنی بھی خراب کیوں نہ ہو اس کی بقاء یقینی ہوتی ہے' کیونکہ اس کے آقا کا مفاد اسی میں ہوتا ہے۔ پرولتاریہ کو اپنی زندگی اور بقاء کا تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔ روزگار سمیت غذا' تعلیم اور صحت کا تحفظ نہیں ہوتا۔ سرمایہ دار جب چاہے اسے روزگار سے نکال سکتا ہے۔ اور اس کے گھر فاقوں کی نوبت آ سکتی ہے۔ بقاء کی ضمانت صرف مجموعی طور پر پورے محنت کش طبقے کو حاصل ہوتی ہے۔ غلام ہمیشہ مقابلے بازی سے باہر رہتا ہے۔ جبکہ پرولتاریہ مقابلے بازی کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہوتا ہے اور اس سے منسوب تمام ذلتوں کا شکار بھی ہوتا ہے۔ غلام کی شکل سماج میں ایک شے کی مانند ہوتی ہے نہ کہ انسان کی۔ جبکہ پرولتاریہ ایک تسلیم شدہ سماجی فرد ہوتا ہے اور ایک معاشرے کا رکن بھی۔ غلام کو پرولتاریہ کی نسبت بقاء کی بہتر ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی ذمہ داری اس کے آقا پر ہوتی ہے۔ جبکہ پرولتاریہ سماجی نشوونما میں اعلیٰ مرحلے سے تعلق رکھنے کے باوجود روزگار سمیت دوسری بنیادی ضرورتوں کے عدم تحفظ کا شکار رہتا ہے۔ غلام اسی وقت اپنے آپ کو آزاد کرا سکتا ہے جب نجی ملکیت کے رشتوں میں محض غلامی کے رشتے کو مٹایا جائے۔ تب وہ پرولتاریہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پرولتاریہ اپنے آپ کو صرف اسی وقت اور صرف اسی صورت میں آزاد کراتا ہے جب وہ کلی طور پر ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ہی کو ختم کرتا ہے۔

سوال- پرولتاریہ کن بنیادوں پر مزارع سے مختلف ہوتا ہے؟

جواب- جاگیردارانہ نظام میں محنت کش کو مزارع کہتے ہیں۔ مزارع کے

پاس زمین کا قطعہ ہوتا ہے۔جس کو وہ پیداواری مقاصد کیلئے استعمال کرتا ہے۔تاہم وہ اس کے بدلے میں پیداوار یا محنت کا بڑا حصہ اپنے مالک یعنی جاگیردار کو دینے کا پابند ہوتا ہے۔پرولتاریہ جن جدید آلات پیداوار کے ساتھ کام کرتا ہے وہ ان کا مالک نہیں ہوتا مگر وہ اپنی پیداوار کے بدلے میں اجرت وصول کرتا ہے۔مزارع کچھ دیتا ہے جبکہ پرولتاریہ وصول کرتا ہے۔مزارع کی بقاء یقینی ہوتی ہے پرولتاریہ کی نہیں ہوتی۔پرولتاریہ کے پاس متبادل کچھ نہیں ہوتا۔مزارع آزادانہ مقابلے کی دوڑ سے باہر ہوتا ہے۔جبکہ پرولتاریہ مقابلے کے دنگل کا حصہ بنتا ہے۔ایک مزارع اسی وقت اپنے آپ کو آزاد کراتا ہے جب وہ بھاگ کر قصبے یا شہر میں جا کر صنعتی نظام کا حصہ بنے۔اور وہاں ایک ہنرمند یا دستکار کی شکل اختیار کرے۔یا پھر اپنے مالک یعنی جاگیردار کو پیداوار یا نقد رقم دے تب وہ ایک آزاد مزارع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔اس کے آزاد ہونے کی صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر وہ جاگیردار کو مار بھگائے اور بذات خود قطعات زمین کا مالک بن بیٹھے۔مختصراً یہ کہ وہ ایک دوسری صورت میں مالکوں کے طبقے اور دوڑ میں شامل ہو۔اس کے برعکس پرولتاریہ اپنے آپ کو صرف اسی صورت میں آزاد کرا سکتا ہے جب وہ مقابلے کی دوڑ کا خاتمہ کرے نجی ملکیت اور طبقاتی تقسیم کی ہر شکل کو مٹا دے۔

سوال- وہ کون سے حالات ہوتے ہیں جو پرولتاریہ کو دست کار سے جدا کرتے ہیں؟

جواب- ہنرمند دست کار جو 18 ویں صدی تک کرہ ارض پر ہر جگہ موجود تھا۔آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں پایا جاتا ہے۔وہ جزوی یا عارضی طور پر ایک پرولتاریہ ہوتا ہے مگر اس کا منشا ہائے مقصد سرمائے کا حصول ہوتا ہے تاکہ وہ اس بل

بوتے پر دوسرے محنت کش کا استحصال کر سکے اور سرمائے میں اضافہ کر سکے۔ اکثر و بیشتر وہ اس مقصد کے حصول میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ جہاں گھریلو صنعت ابھی تک اپنا وجود رکھتی ہے یا جہاں انفرادی پیداوار نے اس قدر آزادی نہیں دی کہ دست کاری کا عمل یا نظام سماجی صنعت میں تبدیل ہو جائے اور تا حال اس نے خوفناک مقابلہ کی شکل اختیار نہ کی ہو۔ وہاں دستکار موجود ہوتا ہے۔ مگر جوں جوں دست کاری کے نظام کی جگہ صنعتی نظام پروان چڑھا وہاں مقابلے کا رجحان پیدا ہوا۔ تب دستکاروں نے اپنے آپ کو یا تو مڈل کلاس میں بدل کر یا سرمایہ دار بن کر آزاد کرالیا۔ یا پھر وہ مقابلے کی دوڑ (صنعتی عمل) میں شامل ہو کر پرولتاریہ کی شکل اختیار کر گئے۔ اب وہ اپنے آپ کو صرف پرولتاریہ کی منظم تحریک سے جوڑ کر استحصالی نظام سے چھٹکارہ حاصل کر سکتا ہے۔ جو کہ آخری تجزیے میں کم و بیش شعوری بنیادوں پر چلنے والی کمیونسٹ یا مزدور تحریک میں شمولیت کے نتیجے میں ممکن ہے۔

سوال- پرولتاریہ کن بنیادوں پر گھریلو دستکار یا چھوٹے پیمانے کی صنعت کے محنت کش سے مختلف ہوتا ہے؟

جواب- 16ویں صدی سے لیکر 18ویں صدی تک گھریلو دستکار پیداواری آلات کا مالک رہا ہے۔ اس کے پاس کھڈی، چرخہ اور دوسرے آلات سمیت زمین کے چھوٹے قطعات بھی ہوتے تھے۔ جہاں وہ فارغ اوقات میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ لیکن پرولتاریہ کے پاس آلات پیداوار سمیت کچھ نہیں ہوتا۔ گھریلو دستکار ہمیشہ اپنے سردار یا سربراہ سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آقا یعنی مالک یا ملازم کے ساتھ پیداواری رشتہ استوار کرتا ہے۔ اس کے برعکس پرولتاریہ بڑے قصبوں یا شہروں میں جہاں صنعت ہوتی ہے، قیام پذیر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق اپنے آجر کے ساتھ کیش یا

نقد رقم کی بنیاد پر ہوتا ہے۔گھریلو دستکار وسیع پیمانے پر پھیلتی ہوئی صنعت کے تابع ہو کر اپنی ملکیت کھو دیتا ہے اور پرولتاریہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

سوال- وہ کیا حالات تھے کہ صنعتی انقلاب رونما ہونے کے باعث معاشرہ بورژوا اور پرولتاریہ طبقات میں بٹ گیا؟

جواب- اول مشینوں نے جب صنعت میں پیداواری عمل کی جگہ لی تو اشیا کی قیمتیں کم سے کم ہونا شروع ہوئیں۔جس کے باعث دستکار یا ہاتھ سے بنائی جانے والی اشیاء کا نظام مٹ گیا۔اس طرح نیم بربریت والے ممالک جو تاریخی ارتقاء سے بیگانہ تھے اور جن کا معاشی دارومدار اس وقت مینوفیکچرنگ پر تھا اپنی تنہائی سے جبراً باہر نکالے گئے۔انہوں نے انگریزوں کی تیار شدہ اشیاء جو نسبتاً سستی تھیں کو مارکیٹ میں آنے دیا اور اپنے دستکاروں کو تباہ کر دیا۔وہ ممالک جن میں ہزاروں سال سے کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی نئے انقلاب اور تبدیلی کے عمل کی زد میں آ گئے۔ انڈیا اور چین میں بھی یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔انگلینڈ میں تیار ہونے والی ایک ایک مشین نے لاکھوں دستکاروں اور مینوفیکچرر کی جگہ لے لی اور ان کی مارکیٹ چھین لی۔ صنعت کے وسیع پیمانے پر پھیلاؤ سے کراہ ارض پر آباد تمام لوگوں کے ایک دوسرے سے روابط استوار ہوئے اور بتدریج تمام چھوٹی اور بڑی منڈیاں ایک بین الاقوامی منڈی میں بدل گئیں۔صنعتی انقلاب کی بدولت ترقی اور تہذیب کے نئے دروازے کھل گئے۔ترقی یافتہ اور قدرے بلند تہذیب یافتہ ممالک سے بہت کچھ کم ترقی یافتہ اور پسماندہ تہذیب کے حامل ممالک میں منتقل ہوا۔اس سے یہ بات یقینی ہوگئی کے ترقی یافتہ ممالک میں جو کچھ بھی ہوگا اس کے اثرات تمام ممالک پر مرتب ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر انگلینڈ یا فرانس کے محنت کش انقلاب برپا کرتے ہیں تو اس کا

براہ راست اثر دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پڑے گا اور جلد یا بدیر وہاں بھی انقلابات جنم لیں گے۔جس کے نتیجے میں محنت کشوں کی حقیقی معنوں میں آزادی اور ترقی کا عمل شروع ہو جائے گا۔

دوئم وسیع پیمانے پر صنعتی نظام نے مینوفیکچرنگ کی جگہ لی تو صنعتی انقلاب نے بورژوا (سرمایہ داروں) کو جنم دیا وراس کی دولت اور طاقت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ اسے ملک کے اولین مراعات یافتہ طبقے میں بدل دیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بورژوا طبقہ نے سیاسی طاقت اور اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اشرافیہ اور جاگیر داروں کو حکمرانی سے محروم کر دیا اور ان کی تمام طاقت اور اداروں کو مسمار کر دیا۔ان سے زمینوں سمیت دیگر مراعات چھین لیں۔گھریلو صنعت اور دستکار کو ان کے استحقاق سے محروم کر کے انہیں تباہ کر دیا۔اور ان کی جگہ وسیع وعریض صنعتی نظام کو بروئے کار لاتے ہوئے آزادانہ مقابلے کی فضا کو پروان چڑھایا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی کہ سماج کے ہر فرد کو کسی نہ کسی طرح اس نظام یا صنعتی عمل کا حصہ بننا پڑا اور ایسے عوامل کو جو سرمائے کے نئے نظام میں رکاوٹ کا باعث تھے نیست و نابود کر دیا گیا۔آزاد مقابلے کے رجحان میں اس بات کا سرعام اعلان کیا گیا کہ سماج کے تمام افراد اس لئے برابر نہیں ہیں کیونکہ ان کے پاس سرمایہ برابر نہیں ہے اور یوں زیادہ سرمائے کے حامل افراد بورژوا سماج کا اعلیٰ طبقہ بن گئے۔سرمایہ داری نظام میں صنعت کے وسیع پیمانے پر پھیلاؤ اور مقابلے کا رجحان اس لئے ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ وہ واحد سماجی کیفیت یا حالت ہوتی ہے جس میں صنعت سازی کا وسیع تر عمل اپنی جگہ بناتا ہے۔گلڈ ماسٹر اور امراء کی سماجی طاقت وحیثیت کو معدوم کرنے کے بعد بورژوازی نے ان کی سیاسی طاقت کو ختم کر دیا۔سماج میں اولین مقام حاصل کرنے

کے بعد انہوں نے سیاست میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کیا۔صنعت اور آزادانہ مقابلے کی شکل کو قانونی حیثیت دے دی اور بعد ازاں تمام ملکوں اور ریاستوں کے آئین کا جزو لاینفک بنا دیا گیا۔سیاسی عمل میں انتخابات اور نمائندگی کا طریقہ کار متعارف کرایا گیا۔ جو بورژوا مساوات پر مبنی تھا۔ یورپ میں اس نے آئینی بادشاہت کی شکل اختیار کی جس میں ووٹ ڈالنے کا حق صرف اس کو تھا جس کے پاس سرمایہ ہوتا۔ گویا سرمایہ دار ہی ووٹ ڈالنے اور انتخابات میں حصہ لینے کا اہل تھا۔یہ بورژوا مقابرین کو منتخب کرتے ہوئے قانون سازی اور ٹیکس کے عمل کی تشکیل کرتے ہوئے ایک بورژوا حکومت کا قیام عمل میں لاتے تھے۔

سوئم' تمام جگہوں پر برپا ہونے والے صنعتی انقلابات نے پرولتاریہ کو ایک ہی طرح پروان چڑھایا۔بالکل اسی طرح جیسے اس نے بورژوا طبقے کو ارتقائی عمل کے دوران نشوونما اور ترقی دیکر پروان چڑھایا۔پرولتاریہ بھی اپنی تعداد کے اعتبار سے اسی نسبت سے بڑھتا گیا۔کیونکہ سرمایہ کاری ہی پرولتاریہ کی تعداد میں اضافہ کرسکتی تھی۔لہذا جوں جوں سرمایہ اور صنعت کا عمل بڑھتا گیا پرولتاریہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔اسی طرح بورژوا اور پرولتاریہ بڑے شہروں میں منتقل ہوتے گئے جہاں صنعتیں زیادہ سے زیادہ منافع بخش ہوتی ہیں اور یوں عوام کی بہت بڑی تعداد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے۔اسی عرصے میں ایک ہی صنعت' ایک ہی جگہ رہنے سے پرولتاریہ کو اپنی اجتماعی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔مزید برآں یہ طریقہ جہاں زیادہ ترقی کرتا ہے وہاں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی جگہ مشینوں سے کام لینے کا عمل تیز تر ہوتا ہے۔وسیع پیمانے پر صنعتی پھیلاؤ وقوع پذیر تو ہوتا ہے لیکن پرولتاریہ کی اجرتیں کم سے کم ہوتی جاتی ہیں۔ان کے شب و روز کٹھن اور بیروزگاری

پھیل جاتی ہے اور حالات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں جو کہ پرولتاریہ کیلئے نا قابل برداشت بن جاتے ہیں۔تب ایک طرف پرولتاریہ کی بے اطمینانی اور دوسری طرف اس کی بڑھتی ہوئی طاقت اسے اپنے حالات بدلنے پر مجبور اور آمادہ کرتی ہے اور وہ انقلاب کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔تب یہی صنعتی انقلاب پرولتاری سماجی انقلاب کا باعث بن جاتا ہے۔

سوال۔صنعتی انقلاب کے مزید کیا اثرات رونما ہوئے؟

جواب۔ بھاپ کے انجن کی ایجاد اور دوسری مشینیں وسیع پیمانے پر جنم لینے والے صنعتی نظام کا باعث آغاز بنی اور محدود وقت میں کم لاگت پر صنعتی پیداوار میں بے تحاشا اضافہ ہوا اور اس پیداوار کے باعث وسیع پیمانے پر صنعتی نظام اور آزادانہ مقابلہ کی روش نے انتہائی حدوں کو چھوا۔سرمایہ داروں کی بہت بڑی تعداد صنعت سازی کے عمل میں کود آئی۔پیداواری عمل میں تیزی کے باعث ضرورت سے زیادہ اشیاء مارکیٹ میں آ گئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیار شدہ چیزیں مارکیٹ میں بک نہیں سکیں۔ایک نام نہاد تجارتی بحران پھوٹ پڑا۔جس کی بدولت فیکٹریاں بند ہو گئیں ان کے مالک دیوالیہ ہو گئے اور محنت کشوں سے روٹی کا نوالہ چھن گیا۔ہر طرف کساد بازاری اور بدحالی چھا گئی۔

کچھ عرصے بعد فاضل پیداوار فروخت کے قابل ہو گئی۔کارخانے دوبارہ چلنا شروع ہو گئے۔اجرتوں میں اضافہ ہوا اور پھر بتدریج کاروبار پہلے کی نسبت بہتر ہو گیا۔تاہم یہ صورتحال زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہی اور پھر اشیا ضرورت فاضل پیداوار کی شکل میں مارکیٹ میں آ گئیں اور ایک نیا بحران شروع ہو گیا جس طرح پہلے آیا تھا۔19ویں صدی کے آغاز سے لیکر آج تک سرمایہ داری اپنے عروج و

زوال یعنی بحرانی کیفیت سے گزرتی رہی اور تقریباً ہر 5 سے 7 سال کے وقفے کے بعد یہ بحران تواتر کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے رہے جس کے باعث محنت کشوں کی زندگیاں اجیرن بنتی رہیں۔ اس صورتحال میں پورے نظام کی بقاء کو انقلابات کے عمومی رجحانات سے خطرات لاحق رہتے ہیں۔

سوال- ان بار بار (دوری) کے تجارتی بحرانوں سے کیا نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں؟

جواب- اول' وسیع پیمانے کی صنعت سازی کے عمل نے آزادانہ تجارتی مقابلے کے رجحان کو جنم دیا اور اب سرمایہ داری آزادانہ مقابلے کی حدود پھلانگ چکی ہے۔ وسیع پیمانے پر صنعت سازی میں مقابلے اور عمومی طور پر صنعتی پیداوار کی انفرادی تنظیم لازمی طور پر جمود کا شکار ہو جاتی ہے اور پھر بالآخر بند ہو جاتی ہے۔ جب تک بڑے پیمانے کی صنعت اپنی موجودہ کیفیت میں چلتی ہے وہ صرف اسی صورت میں اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے جب یہ وقفے وقفے سے آنے والے پے در پے بحرانوں کی قیمت چکائے یا ان کو برداشت کرے۔ لیکن بحران صرف سماج کی تہذیب و ثقافت کی تباہی کا باعث نہیں ہوتا بلکہ پرولتاریہ کے ناسازگار حالات زندگی سمیت بورژوا طبقے کو بھی دیوالیہ کر دیتا ہے گویا ان بحرانوں سے بچنے کیلئے یا تو صنعت سازی کے سلسلے کو ترک کیا جائے جو مکمل طور پر ناممکن ہے یا پھر یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ایک بالکل نئی سماجی تنظیم' سماجی نظام کو نئے سرے سے چلائے جس میں صنعتی پیداوار کو اس کے مالکوں کے مابین آزادانہ مقابلے کی بنیاد پر نہ رکھا جائے بلکہ پورے سماج کی مجموعی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک منظم منصوبہ بندی اور ہر فرد کی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ پیداواری عمل جاری رکھا جائے۔

دوئم' وسیع پیمانے پر صنعت سازی اور پیداوار کے لامحدود پھیلاؤ کے باعث یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا سماجی نظام قائم کیا جائے جس میں ضروریات زندگی کیلئے اتنی وافر مقدار میں پیداوار حاصل کی جا سکے کہ سماج کا ہر فرد اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک مکمل آزادانہ ماحول میں کام کر سکے۔ گویا وسیع پیمانے پر صنعت سازی اور پیداواری گنجائش کے باوجود سماجی ابتری اور تجارتی بحران کی اصل وجہ نئی سماجی تنظیم اور نئے نظام کا نہ ہونا ہے۔ اگر پرانے نظام کی جگہ نئے نظام اور صنعتوں کو چلانے کیلئے نئی سماجی تنظیم کو معروض وجود میں لایا جائے تو ساری بدحالی ' کساد بازاری' بحران اور سماجی ابتری دم توڑ جائے گی۔

لہذا واضح ہو جاتا ہے کہ:

1- تمام سماجی برائیاں (بھوک' غربت' جہالت' پسماندگی' بیماری' بیروزگاری وغیرہ) اس سماجی نظام کی بدولت ہیں جو موجودہ صورتحال سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

2- ایک نئے سماجی نظام کے ذریعے اپنی تمام سماجی برائیوں کے خاتمے کیلئے پیداواری عمل کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی ضرورت ہے ایسے مواقع اور حالات مکمل طور پر تیار ہیں کہ ان تمام برائیوں کو ایک نئے سماجی نظام کے ذریعے مکمل طور پر ختم کیا جا سکے۔

سوال- یہ نیا سماجی نظام کس قسم کا ہوگا ؟

جواب- اس نظام کے تحت سب سے پہلے صنعتوں اور پیداوار کے دوسرے تمام شعبوں پر انفرادی یا سرمایہ داروں کی دسترس کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس نئے نظام کے تحت یہ کارخانے پورا سماج باہم مل کر مشترکہ بنیادوں پر چلائے گا' جس کی بنیاد

مشترکہ منصوبہ بندی اور سماج کے ہر فرد کی بلا امتیاز اور بلا تخصیص شرکت ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یہ مقابلے کے رجحان کا خاتمے کر کے اس کی جگہ جڑت کو دے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں صنعتوں کی انفرادی یا سرمایہ داروں کے دسترس کے باعث فرد کے پاس نجی ملکیت آ گئی ہے جس کے لازمی نتائج منافع ہوس اور تباہی ہوتے ہیں۔ مقابلے کے رجحان کے باعث پوری صنعت محض افراد کے پاس چلی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ نجی مسابقت اور صنعت کے انفرادی انتظام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا نجی ملکیت کی ہر شکل کو مسمار کر کے اس کی جگہ پیداواری عمل میں اشتراکی بنیادوں پر سماجی تنظیم کو پروان چڑھایا جائے اور تمام پیداوار کو باہمی سمجھوتے کے تحت استعمال کیا جائے یعنی اشیا کو مشترکہ ملکیت میں لیا جائے۔ مختصر الفاظ میں اشیا پر نام نہاد ملکیت کا خاتمہ درحقیقت نجی ملکیت کے خاتمے سے ہی ممکن ہے اور یہ واحد ناگزیر اور قابل عمل طریقہ ہے جس سے پورا سماجی نظام بدل جاتا ہے اور جسے صنعت کی ترقی نے ضروری بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ ہمیشہ یہ کہنے میں حق بجانب رہے ہیں کہ نجی ملکیت کا خاتمہ کئے بغیر انقلاب نیا سماجی نظام اور ترقی ممکن نہیں۔

سوال- کیا اس سے قبل نجی ملکیت کا خاتمہ ناممکن تھا؟

جواب- ہاں سماجی نظام میں ہر نو کی تبدیلیاں ملکیتی رشتوں میں ہر انقلاب اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ نئی پیداواری قوتوں کو فروغ دیا جا سکے جو کہ پرانے پیداواری نظام اور ملکیتی رشتوں میں ممکن نہیں ہوتا۔ نجی ملکیت نے بذات خود اسی طرح جنم لیا۔ نجی ملکیت ہمیشہ تو نہیں تھی۔ جب ہم عہد وسطیٰ کے آخر کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں ہمیں پیداوار کے نئے طریقے مینوفیکچرنگ کی شکل میں ابھرتے ہوئے ملتے ہیں۔ جو کہ اس وقت جاگیردار یا دستکار کی ملکیت کے تابع نہیں

ہو سکتے تھے۔ اس طرح مینوفیکچرنگ نے پرانے ملکیتی رشتوں سے جنم لیا اور اسی طرح ملکیت کی ایک نئی شکل کو جنم دیا جو نجی ملکیت کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔

مینوفیکچرنگ اور وسیع پیمانے پر صنعتی ترقی کے پہلے مرحلے میں نجی ملکیت ہی واحد ممکنہ ملکیتی شکل تھی اور اس پر منحصر سماجی نظام ہی واحد ممکنہ سماجی نظام تھا۔ جب تک یہ ممکن نہیں تھا کہ پیداوار اتنی کی جائے جو سب کیلئے کافی ہو تو کچھ زائد یا فاضل پیداوار کے ذریعے سماجی سرمائے میں اضافہ اور پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کیلئے ایک غالب طبقے کی ضرورت تھی۔ جس کی جگہ بورژوا نے لی۔ اس کے برعکس پیداواری قوتوں سے باہر سماج میں دوسرے لوگوں کی ضرورت تھی جو آلات پیداوار کو متحرک رکھ سکیں، جو ایک غریب اور استحصال زدہ طبقہ نے لی اور یوں ایک راستے کا تعین ہوا۔ جس کے تحت یہ طبقات باہم پیداواری رشتے میں اکٹھے ہوئے۔ طبقاتی ساخت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ پیداوار کس مرحلے پر ہے۔ درمیانی عہد میں پیداوار کا انحصار زراعت پر تھا اور اس عمل کے دوران جاگیردار اور مزارع نے جنم لیا اس عہد کے اختتامی دور میں ہمیں مختلف قصبوں اور شہروں میں گلڈ ماسٹر اور نیز دیہاڑی دار مزدور ملتا ہے۔ سترویں صدی میں گھریلو صنعت اور گھریلو دستکار نظر آتے ہیں۔ جب کہ 19 ویں صدی میں پیداواری قوتوں کا پھیلاؤ ایک بے نظیر سطح تک عمل میں آیا اور آج ایسے ذرائع موجود ہیں کہ انہیں انتہائی کم وقت میں مزید فروغ دیا جا سکتا ہے۔ دوسرا جب یہ پیداواری قوتیں چند بورژوا حضرات کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہوں اور عوام کی بہت بڑی تعداد پرولتاریہ میں بدل چکی ہو سرمایہ داروں کی دولت میں بے تحاشا اضافہ اور عوام کی حالت زار انتہائی گھمبیر اور ناقابل برداشت ہو چکی ہو۔ سوئم، یہ زبردست اور باآسانی فروغ پانے والی

پیداواری قوتیں نجی ملکیت اور بورژوازی کی حدود سے اس قدر آگے بڑھ چکی ہیں کہ وہ کسی بھی وقت سماجی نظام میں زبردست ہل چل پیدا کر سکتی ہیں۔ اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ نجی ملکیت کے خاتمہ کے نہ صرف امکانات پیدا ہو چکے ہیں بلکہ یہ عمل ہر حالت اور ہر صورت میں لازمی اور ناگزیر ہے۔

سوال- کیا پرامن طریقہ کار سے نجی ملکیت کا انسداد ممکن ہے؟

جواب- اگر پرامن بنیادوں پر ایسا ممکن ہوتا تو اس کی خواہش ضرور کی جاتی اور کمیونسٹ اس کی مخالفت کرنے والوں کی صف کے تابع نہیں ہوتے۔ کمیونسٹ جانتے ہیں کہ تمام تر سازشیں نہ صرف بے معنی ہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہیں۔ وہ اس بات کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں کہ انقلابات خواہشات کے باغ نہیں ہوتے اور نہ ہی خواہشات کرنے سے انقلاب برپا ہوتے ہیں یا نہ ہی مصنوعی طریقے سے انقلاب درآمد کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ ہر جگہ اور تمام اوقات میں وہ ناگزیر وجوہات اور لازمی حالات ہوتے ہیں جو انقلاب کا باعث بنتے ہیں۔ یہ حالات خواہشات' انفرادی جدوجہد بلکہ طبقات سے بھی بالاتر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شاید عام ہے کہ کم وبیش تمام تہذیب یافتہ ممالک میں پرولتاریہ کے ارتقاء کو بزور طاقت دبایا گیا ہے۔ اس طریقہ سے کمیونسٹوں کے مخالفین بھی اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ انقلاب کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ اگر استحصال زدہ پرولتاریہ کو انقلابی عمل میں شرکت پر مجبور کر دیا جاتا ہے تب کمیونسٹوں کیلئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ پرولتاریہ کے مقاصد کا دفاع عمل کی دنیا میں اس طرح کریں جس طرح قبل ازیں وہ نظریات یا الفاظ کے ذریعے کرتے آئے ہیں۔

سوشلسٹ انقلاب میں نجی ملکیت کا انسداد پرامن طریقے سے ممکن ہے لیکن

حکمران اپنے متروک نظام کو بچانے کیلئے ناگزیر طور پر تشدد کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ریاست کا یہی مقصد ہے لیکن حکمرانوں کے ذرائع ابلاغ اور حاوی سماجی رجحانات تمام تشدد کا ذمہ ایک بہتان کی صورت میں پرولتاریہ اور انقلاب پر ڈال دیتے ہیں۔

سوال- اس انقلاب کا طریقہ، انداز یا راستہ کیا ہوگا؟

جواب- پرولتاری انقلاب میں سب سے پہلے مالیاتی سرمائے کی آمریت کو ختم کر کے ایک حقیقی جمہوری آئین کو روبہ عمل لاتے ہوئے بالواسطہ یا بلاواسطہ پرولتاریہ کی سیاسی حکمرانی قائم کی جائے گی۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں عوام کی اکثریت پرولتاریہ میں بدل چکی ہے اور جبکہ بعض ممالک میں عوام کی اکثریت صرف پرولتاریہ پر ہی مشتمل نہیں بلکہ کسان اور پیٹی بورژوا بھی ان کے ساتھ شامل ہیں وہ بھی اب پرولتاریہ کی شکل میں ڈھل رہے ہیں۔ تاہم انکے مفادات بھی پرولتاریہ کے مفادات سے جڑے ہوتے ہیں اور وہ اپنے سیاسی مفادات کیلئے پرولتاریہ کی جدوجہد پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ لہذا ان کیلئے پرولتاریہ کے مطالبات کو اپنانا لازمی ہوتا ہے۔ ایسی جمہوریت پرولتاریہ کیلئے مکمل طور پر بے معنی ہوگی جس میں فوری طور پر نجی ملکیت کے خاتمے اور پرولتاریہ کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی ضمانت فراہم نہ ہو۔ رائج الوقت رشتوں کے لازمی نتیجے کے طور پر سامنے آنے والے چیدہ چیدہ اقدامات مندرجہ ذیل ہیں۔

1 - نجی ملکیت کو بڑھتے ہوئے ٹیکسوں کے ذریعے محدود تر کرنا۔ وراثتی ملکیت کا خاتمہ۔ عالمی مالیاتی اداروں کے قرضہ جات کی واپسی سے انکار اور دوسرے اقدامات۔

2 - تمام بھاری صنعت' اور حاوی صنعت' زراعت اور مالیاتی اداروں کی ضبطگی ۔زمینوں' فیکٹریوں' ریلوے' بینکوں اور جہازوں کے مالکان کی بے دخلی۔

3 - اکثریتی عوام یعنی پرولتاریہ کے مخالف اور ترک وطن کرنے والے باغیوں کی جائیداد کی مکمل ضبطگی۔

4- زمینوں' فیکٹریوں اور ورکشاپوں کو محنت کشوں کے جمہوری کنٹرول میں دینا' صنعتوں میں محنت کشوں کے درمیان مقابلے کے رجحان کا قلع قمع کرنا۔

5- صنعتی عمل کو تیز تر کرنے کیلئے ہنر مند کارکنوں کی فوج تیار کرنا اور خاص کر زراعت کے شعبے میں جدید سائنسی تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زیادہ پیداوار حاصل کرنا۔

6- مالیاتی نظام کو مرکز کے تابع کرنا اور تمام امور ریاست کے ہاتھ میں لینا۔ ریاستی سرمائے سے ایک نیشنل بینک کا قیام جو مالیاتی امور کی مکمل نگرانی کرے' نجی بینکوں کی مکمل بندش۔

7- قومی صنعتوں میں ترقی' ورکشاپوں' ریلوے اور بحری جہازوں میں بہتری اور ترقی۔ نئے قطعات زمین کو زیر کاشت لانا اور پہلے سے زیر کاشت رقبے میں مزید بہتری لانا۔

8 -طبقاتی نظام تعلیم کا مکمل خاتمہ یکساں نصاب اور معیاری تعلیم کا اجراء۔ تمام بچوں کو تعلیم دینا' ان کی تعلیم کا آغاز فوراً ہی اس وقت شروع کرنا جب وہ اپنی ماؤں کی دیکھ بھال یا ضرورت سے فراغت پالیں۔قومی سطح پر تعلیم اور پیداواری عمل دونوں کو باہم طریقے سے چلانے کا وسیع پیمانے پر انتظام۔

9- صنعت اور زراعت سے وابستہ افراد کیلئے قومی زمین پر جدید مشترکہ

رہائش گاہوں کی تعمیر اور ان کی طرز زندگی میں شہری اور دیہی دونوں کے مفید پہلوؤں کی آمیزش تا کہ یکطرفہ پن ختم ہو اور خامیوں کو دور کیا جا سکے۔

10 -صحت، علاج، تعلیم اور دوسری بنیادی ضروریات کا مفت اجراء کیونکہ یہ مراعات نہیں بلکہ کسی بھی مہذب معاشرے میں انسان کا بنیادی حق ہوتی ہیں۔ ٹرانسپورٹیشن کے تمام ذرائع کو قومی تحویل میں لینا۔

اس عمل میں ایک قدم اٹھانے سے دوسرا اس کی تقلید کرے گا۔ اس عمل میں سب سے پہلے نجی ملکیتوں پر ایک بھرپور حملہ کرنا ناگزیر ہوتا ہے پھر پرولتاریہ آگے بڑھنے پر مجبور ہوگا اور بعد ازاں وہ سارے سرمائے، زراعت، صنعت، ٹرانسپورٹ، تجارت اور دوسرے شعبوں کو ریاست کے کنٹرول میں لانے پر توجہ مرکوز کر دے گا، جو محنت کشوں کے جمہوری کنٹرول میں ہوتی ہے۔ ان عوامل کی مرکزیت کے باعث ترقی کے عمل پر ایک دور رس اثر پڑتا ہے اور جس طرح پرولتاریہ کی شب و روز محنت اور جمہوری نظام کے باعث پیداواری قوتیں ترقی کرتی ہیں اسی طرح یہ تمام شعبے بھی ترقی کرتے ہیں۔ بالآخر جب سارا سرمایہ، تمام پیداوار اور دیگر کاروبار عوام کے مشترکہ ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں تو نجی ملکیت کا انہدام ہو جاتا ہے۔ روپیہ پیسہ بے معنی ہو جائے گا اور پیداوار کا مقصد جب منافعے کی ہوس سے ضروریات زندگی کی فراہمی میں تبدیل ہو جائے گا تو پیداوار اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ انسان کی حالت مکمل طور پر بدل جائے گی۔ انسان کی حالت بدلنے سے سماجی تعلقات کی آخری پرانی شکل بھی بدل کر رہ جائے گی۔

سوال- کیا یہ ممکن ہے کہ یہ انقلاب محض ایک ہی ملک میں رونما ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہو سکے؟

جواب۔نہیں' بین الاقوامی منڈی کا جنم اور وسیع پیمانے پر صنعتی ارتکاز کے باعث کرہ ارض پر آباد تمام انسان ایک دوسرے سے باہم منسلک ہیں اور خاص کر ترقی یافتہ ممالک میں سماجی ترقی کے باہمی ربط نے سماج کو اس نہج پر پہنچا دیا ہے جہاں عوام بورژوا اور پرولتاریہ دو واضح اور فیصلہ کن طبقات میں بٹ چکے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان تضاد' جاری کشمکش اور جدوجہد ہی درحقیقت آج کے دور یا اس عہد کی جدوجہد ہے لہذا کمیونسٹ انقلاب کو محض ایک ملک یا قوم کے اندر محدود کر کے بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔اس کی نوعیت کا انحصار کسی بھی ملک کی صنعت سازی کے عمل میں تیزی' سرمائے کا ارتقاء اور دوسرے عوامل پر ہوتا ہے۔مثلاً اگر یہ کسی نسبتاً کم ترقی یافتہ ممالک میں مشکل سے رونما ہوگا تو ترقی یافتہ ملک میں تیزی سے رونما ہوگا۔جس کے اثرات بہت ہی تیزی سے دوسرے ممالک پر پوری طاقت اور تمام تر توانائی سے پڑیں گے۔یہ انقلاب ان کے ترقی کے عمل کو تیز تر کر دے گا۔یہ عالمگیر انقلاب ہے اور اس کی نوعیت بھی عالمی ہے' اس کا دائرہ کار بھی عالمی ہے۔

یہ درست ہے کہ پوری دنیا میں ایک وقت میں عالمی انقلاب برپا نہیں ہوگا۔ لازمی طور پر یہ کسی ایک قومی ریاست میں برپا ہوگا۔لیکن یہاں طویل عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔اس لئے اس کو پھیلانا ہوگا ورنہ ایک ملک میں اس کا زوال پزیر ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔لیکن کسی ایک سماج میں ابھرنے والا انقلاب عالمی انقلاب کا انتظار نہیں کر سکتا بلکہ اس ملک میں برپا ہو کر دوسرے ممالک میں انقلابی عمل کو تیز کرنے اور تقویت بخشنے کا موجب بنے گا۔

درحقیقت کسی بھی ملک میں کامیاب انقلاب کا آغاز دوسرے ممالک اور باقی دنیا پر ایک فیصلہ کن اثر چھوڑے گا۔یہ دنیا ماضی کی نسبت کہیں زیادہ ایک دوسرے

سے جڑی ہوئی ہے' گلوبلائزڈ ہے۔

سوال-نجی ملکیت کے خاتمے کے کیا دورس نتائج برآمد ہونگے ؟

جواب-محنت کش عوام تمام پیداواری قوتوں' تجارت کے ذرائع اوراشیاء کی تقسیم اورتبادلے کے متعلق تمام امورکوانفرادی ہاتھوں سے اپنی مشترکہ ملکیت میں لے لیں گے اور پورے معاشرے کی ضروریات اور دستیاب وسائل کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کے تحت انتظامات کریں گے۔اس طریقے میں سب سے اہم پیش رفت یہ ہوگی کہ موجودہ وسیع پیمانے پر چلنے والی صنعت جوانفرادی ملکیت کی وجہ سے منفی نتائج کا باعث ہے کامکمل خاتمہ ہو جائیگااور پھر بحران نہیں آئیں گے۔ فاضل پیداوار اور جوموجودہ نظام کے اندر زائد پیداوارگردانی جاتی ہے اوراس کے باعث اقتصادی بدحالی اور بحران جنم لیتا ہے۔یہ فاضل پیداوار بے کاراور بے معنی نہیں ہوگی بلکہ اسے مزید وسعت دی جائے گی۔فاضل پیداوار بحران اور بدحالی کا باعث بننے کی بجائے معاشرے کے ہرفرد کی ضروریات کومکمل تحفظ فراہم کرے گی اور نئے ذرائع پیداوارتخلیق کرنے کا باعث بھی ہوگی اس کی وجہ سے ترقی کے نئے ادوارشروع ہونگے جوبغیر کسی تغیر یا وقفے کے جاری وساری رہیں گے۔مگر یہ سارا عمل موجودہ (سرمایہ دارانہ) سماجی نظام کومنہدم کرنے سے ہی ممکن ہوگا۔

وسیع پیمانے پرصنعت سازی نجی ملکیت کے دباؤ سے آزاد ہو جائے گی اس میں اسی پیمانے کی وسعت آئے گی جیسی گھریلو دستکاری کے مقابلے میں جدید صنعت میں آئی تھی۔صنعت میں اس نوع کی ترقی اور پیش رفت کی وجہ سے معاشرے کے ہرفرد کی تمام ضروریات باآسانی پوری ہونگی۔اسی طرح زراعت جو کہ نجی ملکیت اورزمین کے ٹکڑیوں میں تقسیم ہونے کے باعث زیادہ سودمند نہیں ہے

اس دباؤ سے آزاد ہو جائے گی۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی بنیاد پر کی جانے والی اصلاحات عوام کی ضروریات پورا کرنے کی ضامن ہونگی۔ یوں اشیاء اتنی وافر مقدار میں پیدا ہونگی کہ معاشرے کے ہر فرد کی تمام ضرورتوں یعنی مانگوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ طبقات کا وجود مٹ جائے گا۔ یہ مخاصمانہ کیفیت غیر ضروری ہو گی اور نئے سماجی نظام میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہو گی۔

طبقات کا وجود محنت کی تقسیم کے نتیجے میں ہوا۔ محنت کی تقسیم جو اس وقت موجود ہے مکمل طور پر ختم کی جائے گی۔ صرف سائنس و ٹیکنالوجی کے حامل کیمیائی و میکانکی آلات پیداوار صنعتی و زرعی پیداوار کو اس سطح تک بڑھانے کیلئے کافی نہیں جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ بلکہ ان آلات پیداوار کو پوری طرح استعمال میں لانے میں عوام کی صلاحیت ترقی میں مزید اضافے کا باعث بنے گی۔ جس طرح 18 ویں صدی کے کسانوں، دستکاروں، ہنرمندوں اور مینوفیکچرز کی حالت صنعتی انقلاب کے باعث مکمل طور پر بدل گئی اسی طرح سماج میں اشتراکی طریقہ پیداوار ایک بالکل مختلف انسان کو جنم دے گا۔ موجودہ طبقات مٹ جائیں گے۔ غیر طبقاتی معاشرہ جنم لے گا اور معاشرے میں مشترکہ پیداواری عمل ترقی میں اضافے کا باعث ہوگا۔ پیداواری عمل میں جدت کیلئے نئے عوامل اور وسائل کی ضرورت ہو گی۔ مشترکہ پیداواری عمل محض چند افراد تک ہی نہیں محدود ہوگا جیسے آج کل بورژوا نظام میں ہے۔ جہاں آج ہر فرد انفرادی طور پر پیداوار کے کسی ایک شعبے تک محدود ہے۔ اسے محض ایک محدود عمل تک محدود کر کے اس کا استحصال کیا جاتا ہے وہ سارے پیداواری عمل میں محض اپنی کسی ایک صلاحیت کو فروغ دینے پر مجبور ہوتا ہے اور بعض اوقات ایک پیداواری شعبے کے محض کسی ایک حصے تک محدود ہوتا ہے۔ گویا صنعت سازی کا

عمل سرمایہ دارانہ نظام میں فرد کو کم سے کم مفید بناتا ہے۔

کمیونل (مشترکہ) منصوبہ بند صنعت و معیشت پورے معاشرے کے باہمی اشتراک سے چلتی ہے وہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے اور پیداواری عمل کو ترقی دینے کی صلاحیت اور گنجائش کو بروئے کار لاتی ہے۔ محنت کی تقسیم (سرمایہ دارانہ نظام میں) ایک فرد کو کسان بناتی ہے تو دوسرے کو موچی۔ تیسرے کو صنعتی کارکن تو چوتھے کو سٹاک مارکیٹ آپریٹر اور یہ سارے افراد مشینوں کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم مکمل طور پر مٹ جائے گی۔ اس نظام کے تحت دی جانے والی تعلیم نوجوانوں کو جلد ہی اس قابل بنا دے گی کہ انہیں پیداوار کے تمام عمل پر مہارت ہو اور وہ ایک شعبے پر دسترس رکھنے کے بعد دوسرے شعبوں میں بھی مہارت حاصل کر کے معاشرے اور بنی نوع انسان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں اور یوں وہ زندگی بھر ایک اکتا دینے والے پیشے یا کاروبار سے نجات حاصل کر سکیں گے جو کہ دراصل تقسیم محنت کے مروجہ نظام کی بدولت ہے جس نے ہر فرد کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ ایسا معاشرہ جس کی بنیاد کمیونزم پر ہو گی ہر فرد کو ایک جیسے مواقع فراہم کرے گا کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مختلف شعبوں میں بروئے کار لائے۔ جب یہ عمل شروع ہو گا تو طبقات کا وجود لازمی طور پر مٹ جائے گا۔ یوں کمیونزم کی بنیاد پر استوار کیا جانے والا سماج طبقات کی باہمی کشمکش اور مقابلے کی دوڑ سے آزاد ہو گا اس طرح شہروں اور دیہاتوں میں پایا جانے والا فرق مٹ جائے گا۔ زراعت اور صنعت کو شہر یا دیہات میں آباد عوام بلا تامل چلانے کے ماہر ہونگے۔ اشتراکی بنیادوں پر میل جول کے باعث ان کے درمیان دوریاں ختم ہو جائیں گی۔ کمیونسٹ بنیادوں پر قائم ہونے والا سماج جہاں ایک طرف

طبقات کے وجود کا متحمل نہیں ہوسکتا دوسری طرف ایسا سماج وہ ذرائع بھی فراہم کرتا ہے جو طبقاتی تفریق کو ختم کر سکے۔ زرعی آبادی کی محض زمینوں سے جڑت اور صنعتی آبادی کی محض صنعتوں تک محدودیت ایک ایسی کیفیت ہے جس سے زراعت اور صنعت دونوں میں ترقی کا عمل رک جاتا ہے اور یوں یہ مجموعی طور پر پورے معاشرے کی ترقی کے آگے ایک دیوار یا رکاوٹ بن جاتی ہے۔

عوام کے باہمی اشتراکی عمل کے نتیجے میں تمام افراد کا تعاون، پیداواری عمل میں مشترکہ منصوبہ بندی کے تحت شمولیت ہی پیداوار میں اضافے کا باعث بنے گی جس میں ہر فرد کی ضروریات احسن طریقے سے پوری ہونگی، بے یقینی اور بے چینی کی صورتحال کا قلع قمع ہو جائے گا۔ پراگندگی مٹ جائے گی اور موجودہ نظام جس میں چند افراد کی ضروریات پوری کرنے کیلئے اکثریتی عوام کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ طبقات بمعہ اپنے تضادات کے مٹ جائیں گے۔ موجودہ تقسیم محنت کے نظام کو ختم کرتے ہوئے عوام کی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع فراہم ہونگے۔ صنعتی تفریق کا خاتمہ اور دوسری سرگرمیوں کے ذریعے عالمی ذرائع پیداوار میں عالمگیر بنیادوں پر شراکت اور استفادے، قصبوں اور ملکوں کے بندھنوں سے آزاد ہو کر نجی ملکیت کے منہدم ہونے کے دور س نتائج برآمد ہونگے۔

سوال- کمیونسٹ نظام کے خاندان پر کیا اثرات مرتب ہونگے؟

جواب- اس نظام میں افراد کے درمیان پروان چڑھنے والے رشتے حسد، لالچ اور منافقت سے پاک نوعیّتوں کے ہونگے جن کی بنیادیں حقیقی معنوں میں انسانی اقدار پر ہوں گی۔ مگر یہ نجی ملکیت کے خاتمہ سے ہی ممکن ہوگا۔ بچوں کو اشتراکی بنیادوں پر تعلیم دی جائے گی۔ شادی جو ایک سماجی معاہدے کی شکل ہے

اپنے خاوند پر انحصار یا محتاجی' بچوں کا والدین پر اخراجات کا بوجھ اور ان کا اپنے والدین پر انحصار جو نجی ملکیتوں کی دین ہے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہم کمیونسٹ سماج میں عورت کی مشترکہ ملکیت کے بارے میں جاہل بورژوا دانشوروں کی واعظانہ آہ و پکار کا یہ جواب دیتے ہیں کہ عورت کی مشترکہ ملکیت ایک ایسی کیفیت ہے جس کا تمام تر تعلق بورژوا سماج سے ہے۔ جس میں عورتوں کی حیثیت محض ایک جنس کی ہے۔ اسے فحاشی کا اڈا' بازار حسن' عصمت فروشی اور طوائف کے مکروہ دھندوں پر مجبور کیا جاتا ہے۔ عصمت فروشی دراصل نجی ملکیت پر بنیاد رکھتی ہے۔ نجی ملکیت کے خاتمہ کے بعد کوئی عورت اپنی عزت کی نیلامی کی بھینٹ چڑھنے پر مجبور نہیں ہو گی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے منہدم ہونے کے بعد عورت جنسی بنیاد پر تفریق اور غلامی کے جبر سے آزاد ہو جائی گی۔ وہ ایک حقیقی' پرمسرت' باعزت اور باوقار زندگی گزارے گی۔ کمیونسٹ معاشرہ درحقیقت عورتوں کو مشترکہ ملکیت بنانے کی بجائے اس گھناؤنے تعصب کو ختم کرتا ہے۔

سوشلسٹ سماج میں خاندان ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت اور بنیادیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جہاں رشتوں سے مفاد پرستی' جذبوں سے خودغرضی اور ناطوں سے مجبوری اور محتاجی کا یکسر خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سوال۔ قوموں یا قومیتوں کے متعلق کمیونزم کا کیا رویہ ہوگا؟

جواب۔ قومیں اور قومیتیں عوام کے اتحاد کے تابع ہو جائینگی لوگ اس نظام میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھل مل جائیں گے کہ مذہب' رنگ' نسل' علاقہ یا وطن کی بنیاد پر تمام تر تعصبات اور نفرتیں مٹ کر رہ جائیں گی۔ قومی وقار اور ثقافت کے نام پر موجود گھناؤنے اور ماضی بعید کے ظالمانہ رسم و رواج ختم ہو

جائینگے۔تمام ثقافتوں کے حسین پہلوؤں کونکھار ملے گا۔تمام زبانوں کی ترقی اور ترویج کیلئے وسائل میسر آئیں گے۔قومی جبر واستحصال کا خاتمہ ہوگا۔تمام قوموں کی سوشلسٹ فیڈریشن میں شمولیت مکمل رضا کارانہ رائے' جہاں سرمائے اور ملکیت کی ہوس کا جبر نہ ہو' کے ذریعے ہو گا۔ اس سے سوشلسٹ سماج مختلف رنگوں'نسلوں' زبانوں اور ثقافتوں کا ایک حسین گلدستہ بنے گا جس میں تعصّبات اور نفرتوں سے پاک معاشرہ لطیف جذبات اور احساسات کو جنم دے گا۔جہاں یہ سماج نسل انسان کی عظیم تر یکجہتی --انسانیت کو کہیں بلند اور خوشحال پیمانے پر حاصل کرنا ممکن بنا سکے گا۔اس نظام میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ طبقاتی تقسیم سمیت ہر نوع کی دوسری تقسیم کا مکمل خاتمہ ہو جاتا ہے لوگ باہم مل جل کر رہتے ہیں۔مگر یہ تمام تر حاصلات نجی ملکیت کے خاتمے سے ہی ممکن ہیں۔

سوال- مارکسزم کیا ہے؟

جواب- کارل مارکس (1818-1883ء) کے نظریات کے مجموعے کو مارکس ازم کہا جاتا ہے۔مارکس نے انیسویں صدی کے تین بڑے نظریاتی رجحانات کو آگے بڑھاتے ہوئے نقطہ عروج تک پہنچایا۔کلاسیکی جرمن فلسفہ' برطانوی سیاسی معاشیات اور تاریخی مادیت۔ اس کے مخالفین بھی اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ مارکس کے انتہائی ہم آہنگ اور جامع نظریات ہی' بحیثیت مجموعی جدلیاتی مادیت اور سائنسی سوشلزم کی تشکیل کرتے ہیں اور دنیا بھر کے ممالک میں محنت کشوں کی تحریک کے نظریات اور پروگرام ہیں۔یہی سوشلسٹ انقلاب اور کمیونسٹ معاشرے کے حصول کی بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوال- مارکس ازم، لینن ازم اور ٹراٹسکی ازم کیا ہیں؟

جواب- یہ اصطلاح عام طور پر انقلابی مارکسسٹوں کیلئے استعمال کی جاتی ہے (ایسے لوگ جو سمجھتے ہیں کہ موجودہ نظام کی جگہ ایک نیا نظام نافذ کرنا ضروری ہے) اس کے برعکس اصلاح پسند یہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام کو رحم دل اور شریف النفس بنایا جا سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔ لینن ازم حقیقتاً مارکس کے تصورات کے سامراجی عہد (یعنی مالیاتی سرمائے اور اجارہ داریوں کے غلبے اور نوآبادیاتی دنیا پر بڑی طاقتوں کے مکمل تسلط کا دور) تک توسیع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

لیکن مارکس ازم یا لینن ازم کے حوالے سے ابھی تک کچھ پراگندگی پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ سٹالن اور ماؤ کے جبکہ دوسرے لوگ ٹراٹسکی کے پیروکار ہیں۔ سٹالن اور ماؤ مارکسسٹ نہیں تھے بلکہ درحقیقت وہ مارکس ازم کے نظریات کے مسخ شدہ اور زوال پذیر رجحانات کی نمائندگی کرتے تھے کیونکہ ان کے نظام میں ریاست مزدوروں کے جمہوری کنٹرول کی بنیاد پر قائم نہیں تھی بلکہ بیوروکریٹوں کے آمرانہ غلبے کی بنیاد پر قائم تھی۔ جو مزدور ریاست کے بدن سے طفیل خوروں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔

ٹراٹسکی ازم (جس نے 1924ء میں لینن کی وفات کے بعد سٹالن کی رجعتی پالیسیوں سے اختلاف کرنے والوں کی راہنمائی کی تھی) درحقیقت مارکس ازم اور لینن ازم کا ہی تسلسل ہے لیکن بہت سے لوگ ٹراٹسکی ازم کی اصطلاح خود کو سٹالنسٹوں سے الگ کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے مارکسسٹ ٹراٹسکی ازم کو مارکس ازم اور لینن ازم کا تسلسل سمجھنے کے باوجود خود کو مارکسسٹ لیننسٹ کہلوانے پر اکتفاء کرتے ہیں کیونکہ اس کے پیروکاروں میں سے بہت سوں نے

ایسی جنونی اور الٹرا لیفٹ پالیسیاں اپنائی ہیں کہ ان سے ٹراٹسکی ازم کا نام بدنام ہوا ہے۔ٹراٹسکی نے مارکسسٹ نظریئے کیلئے جو خدمات سرانجام دی ہیں ان میں سے دو انتہائی اہم ہیں۔اول' سٹالن ازم کی نوعیت کا سائنسی تجزیہ اور دوئم' انقلاب مسلسل کا نظریہ جو نوآبادیاتی دنیا کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

سوال- جمہوریت اور سوشلزم بیک وقت کیسے وجود رکھ سکتے ہیں؟

جواب- اول تو یہ تصور ہی غلط ہے کہ مارکس ازم اور جمہوریت ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کی مالیاتی آمریت (جسے عام طور پر 'جمہوریت' قرار دیا جاتا ہے) کے تحت حقیقی جمہوریت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ہاں' چند سالوں بعد آپ صدارتی اور پارلیمانی انتخابات میں ووٹ ضرور ڈال سکتے ہیں۔ لیکن ذرا غور فرمائیں کہ ان انتخابات میں حصہ کون لیتا ہے۔صرف وہ لوگ جن کے پاس اس کام کیلئے وافر مقدار میں دولت موجود ہوتی ہے۔ان کی انتخابی مہمات میں پیسہ کون لگاتا ہے؟ بڑی بڑی کارپوریشنیں اور سرمایہ دار۔لہذا آپ کے پاس کوئی حقیقی متبادل نہیں ہوتا۔عملاً یہ جمہوریت صرف امیر اور طاقتور لوگوں کیلئے ہے' یعنی بورژوا جمہوریت۔

اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ منتخب ہونے والی حکومت کے پاس پالیسیوں پر عملدرآمد کے حوالے سے حقیقی معنوں میں زیادہ گنجائش موجود نہیں ہوتی۔اگر امریکہ کے تین امیر ترین اشخاص کے پاس ساڑھے گیارہ کروڑ عام امریکی شہریوں کی اجتماعی دولت کے برابر دولت موجود ہوگی تو درحقیقت **ملک** کو بھی وہی چلائیں گے۔اپنے معاشی فیصلوں کے ذریعے وہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کا فیصلہ کرتے ہیں یعنی روزگار کے مواقع' علاج معالجے کی سہولیات اور تعلیم وغیرہ وغیرہ۔

جب ان بڑی بڑی کارپوریشنوں کے مفادات کو خطرہ درپیش ہوتا ہے تو وہ انہیں بچانے کیلئے حکومت کو استعمال کرتے ہیں مثال کے طور پر جب 1973ء میں چلی میں سلواڈور ایاندے کی جمہوری طور پر منتخب ہونیوالی حکومت نے تانبے کی کانوں اور ٹیلی کمیونیکیشن (جو امریکی کمپنیوں کی ملکیت تھیں) کو قومیانے کا فیصلہ کیا تو ان کمپنیوں نے کروڑوں ڈالر خرچ کر ڈالے اور پھر سی آئی اے نے چلی میں ایک فوجی بغاوت کے ذریعے ایاندے کو قتل کروا کے وہاں کی جمہوری طور پر منتخب ہونے والی حکومت کی جگہ پنوشے کی وحشیانہ فوجی آمریت قائم کر دی۔ 2004ء میں ہونے والے امریکی صدارتی انتخابات میں 4 بڑی کمپنیوں نے بش کی انتخابی مہم میں 10.3 ملین ڈالر لگائے بش کے صدر بننے کے تین ماہ میں انکو ٹیکسوں میں چھوٹ کی مد میں 5 ارب ڈالر کا منافع حاصل ہوا۔ اس ایک مثال سے پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت دراصل کتنا بڑا منافع بخش اور مجرمانہ کاروبار ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف سرمایہ دارانہ اجارہ داریوں میں یہ صلاحیت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ کیونکہ انہوں نے ریپبلکن اور ڈیموکریٹک دونوں پارٹیوں میں کروڑوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی ہوتی ہے۔ آخری تجزیے میں حکومت اور سیاسی پارٹیاں بڑے سرمایہ داروں کے ہی اوزار ہیں اور وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کن پالیسیوں پر عمل درآمد ہوگا۔ ان پارٹیوں کا وجود خلاء میں نہیں ہوتا بلکہ ارب پتی سرمایہ داروں اور کارپوریشنوں نے ان میں براہ راست سرمایہ لگایا ہوتا ہے اور یہ انہیں کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہ حقیقتاً 'قانون' 'سچائی' یا 'انصاف' کیلئے نہیں بلکہ ان سرمایہ داروں کے مفادات کیلئے کام کرتی ہیں جو ان کے منہ میں لقمے ڈالتے ہیں۔

اس کے برعکس سوشلسٹ انقلاب کے بعد دنیا کے معاشی وسائل نجی ملکیت

میں نہیں بلکہ آبادی کی اکثریت کے ہاتھوں ہونگے جو ان کو جمہوری طریقے سے کنٹرول کریں گے اور چلائیں گے۔ یہ ایک حقیقی جمہوریت ہوگی جس میں لوگوں کو صحیح معنوں میں اپنی زندگیوں پر اختیار رہوگا۔ وہ جمہوری طریقے سے اپنے نمائندوں کو منتخب کر کے حکومت میں لائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ ان نمائندوں کو معیشت پر حقیقی اختیار بھی حاصل ہوگا اور وہ چیزوں کو حقیقی معنوں میں تبدیل بھی کر سکیں گے۔ اگر یہ اہل کار ان کاموں کو احسن طریقے سے سرانجام نہیں دے سکیں گے، جن کے لئے ان کا انتخاب عمل میں لایا گیا تھا تو انہیں فوری طور پر واپس بھی بلایا جا سکے گا۔ اہل کاروں کو ایک ہنرمند مزدور کی اجرت سے زیادہ تنخواہ بھی نہیں ملے گی۔ آج کل کی طرح نہیں کہ ان 'منتخب شدہ' اہل کاروں کی 'مراعات' ان کی تنخواہوں سے بھی تجاوز کر جائیں۔ مختلف امور کی انجام دہی کیلئے ایسے افراد سامنے آئیں گے جو واقعی وہ کام کرنا چاہتے ہوں گے، اس لئے نہیں کہ اس کی وجہ سے انہیں اضافی فوائد اور مراعات حاصل ہوں گی۔ یہ اہل کار معاشرے کے تمام اراکین میں سے منتخب ہوں گے۔ جیسا کہ لینن نے کہا تھا 'کوئی باورچی بھی اس قابل ہوگا کہ وزیراعظم بن سکے'۔ یہ حقیقی معنوں میں عوام کی جمہوریت ہوگی۔

اس مسئلے میں ایک اور پیچیدگی یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لوگ عام طور پر مارکسزم کو بھی اس نظام میں گڈمڈ کر دیتے ہیں جو سوویت یونین میں قائم تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہاں جمہوریت جیسی کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ سوشلزم نہیں تھا۔ وہ سٹالن ازم تھا یعنی ایک ایسا نظام جس میں معیشت ریاست کے ہاتھ میں تھی لیکن شہری کسی بھی طور اسے چلانے میں حصہ دار نہیں تھے۔ نوکر شاہی نے ریاستی مشینری پر قبضہ کر لیا تھا اور اسے اپنے مفادات کیلئے استعمال کرتی تھی۔ اس کا

سوشلزم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اقتدار میں آنے کیلئے سٹالن کو لاکھوں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کا خون کرنا پڑا تھا جن میں اس بالشویک پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے اکثر اراکین بھی شامل تھے جنہوں نے 1917ء کے روسی انقلاب کی راہنمائی کی تھی۔قصہ کوتاہ یہ کہ حقیقی سوشلزم مارکسزم حتمی جمہوریت یعنی مزدوروں کی جمہوریت پر قائم ہے۔وہ جمہوریت جو عوام کی اکثریت کے ذریعے عوام کی اکثریت کیلئے ہوتی ہے۔ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ سوشلزم کیلئے مزدور جمہوریت اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسانی جسم کیلئے آکسیجن۔

سوال-سوشلزم کے تحت پیداوار کو سماجی کیسے بنایا جائے گا اور دولت کی تقسیم کس طرح کی جائے گی؟

جواب-جدید پیداوار کی نوعیت پہلے ہی سماجی ہے۔مثال کے طور پر کوئی بھی تنہا آدمی تمام کی تمام کار یا سارا کمپیوٹر نہیں بنا سکتا۔جدید معیشت اس قدر پیچیدہ ہے کہ کمپیوٹر جیسی چیز بنانے کیلئے دنیا بھر میں لاکھوں افراد کی کاوشوں کی ضرورت ہوتی ہے خام مال مہیا کرنے والوں سے لیکر ہارڈ ویئر ڈیزائن کرنے والوں تک اور اسے اسمبل کرنے والوں سے لیکر آپ کے گھر کے دروازے تک پہنچانے والوں تک۔یہ ایک اجتماعی عمل ہے۔تاہم ان تمام محنت کشوں کی تخلیق کردہ دولت برابر تقسیم نہیں ہوتی۔ارب پتی سرمایہ دار اور بڑی بڑی کارپوریشنیں اس کا بہت بڑا حصہ خود ہضم کر جاتی ہیں۔یہ جدید محنت کش طبقہ ہی ہے جو روزمرہ بنیادوں پر فیکٹریاں اور کاروبار چلاتا ہے۔

محنت کش ہی اجتماعی طور پر سماج کی دولت کی تخلیق کرتے ہیں۔تاہم انہیں اپنی کاوشوں کا حقیقی صلہ نہیں ملتا۔یہ درست ہے کہ انہیں اجرتوں میں اضافے اور

بونسوں کی شکل میں کچھ بچے کچے ٹکڑے مل جاتے ہیں لیکن سرمایہ دار خود جو 'بونس' کھاتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔ (مثال کے طور پر امیر صنعتی ممالک میں بڑی کارپوریشنوں کے عہدیداروں کو کئی کئی لاکھ ڈالر کرسمس کے تحفے کے طور پر ملنا معمول کی بات ہے)۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس دولت کو ان لوگوں میں تقسیم کیا جائے جو درحقیقت اس دولت کو تخلیق کرتے ہیں۔

سوال- بیگانگی کیا ہے؟

جواب- سرمایہ داری نظام کی بیگانگی کی بنیادی وجہ محنت کش اور اس کی محنت سے تخلیق ہونے والی پیداوار کے درمیان لاتعلقی اور سرمایہ دارانہ استحصال پر پڑا ہوا پردہ ہے جو اجرتی محنت اور سرمائے کے درمیان حقیقی رشتوں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔محنت کش جو پیداوار اور اس کی قدر تخلیق کرنے میں محنت صرف کرتا ہے اس کا صلہ اس کو نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہی ہاتھ سے بنائی ہوئی بہت سی چیزوں سے محروم رہتا ہے۔اس سے محنت اور پیداوار کے درمیان بیگانگی جنم لیتی ہے۔جس کا شکار محنت کش طبقہ اور پورا معاشرہ شکار بنتا ہے۔اس پوشیدہ استحصال سے اشیاء سے بے جا لگاؤ کا مرض جنم لیتا ہے جس کے باعث اشیاء جانداروں کی خصوصیات اپنا لیتی ہیں اور انسان کمتر ہو کر 'چیزوں' کی سطح تک آ جاتے ہیں۔ یہ مسخ شدہ اور پراسرار (بیگانہ) رشتے انسانی شعور کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور پھر یہ فطری اور ناگزیر سمجھے جانے لگتے ہیں۔اس طرح انگریزی زبان میں محنت کشوں کو 'ہاتھ' کہا جاتا ہے اور ہم اکثر حوالہ دیتے ہیں کہ فلاں آدمی کی 'قدر و قیمت ایک ارب ڈالر ہے'۔لیکن اس بیگانگی کی بنیاد پیداواری رشتوں یا قانونی زبان میں کہا جائے تو ملکیتی رشتوں پر قائم ہے۔

سوال- کسی عہد کے حاوی تصورات کیا ہوتے ہیں؟

جواب- ہر عہد کے غالب خیالات حکمرانوں کے خیالات ہوتے ہیں یعنی جو طبقہ سماج کی حکمران مادی قوت ہوتا ہے وہ حکمران فکری قوت بھی ہوتا ہے۔ وہ طبقہ جس کے قبضہ میں مادی پیداوار کے ذرائع ہوتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ ذہنی پیداوار کے ذرائع پر بھی قابض ہوتا ہے۔ لہذا عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی پیداوار کے ذرائع سے محروم لوگوں کے خیالات اس کے تابع ہوتے ہیں۔ حکمران خیالات غالب مادی رشتوں کے فکری اظہار کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ خیالات تصور کئے جانے والے مادی رشتے اصل میں وہ رشتے ہیں جو کسی طبقے کو حکمران طبقہ بناتے ہیں۔ لہذا یہ خیالات اس کے غلبے کے خیالات ہوتے ہیں۔ حکمران طبقہ جن افراد پر مشتمل ہوتا ہے وہ دیگر چیزوں کے علاوہ شعور کے بھی مالک ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ دیگر چیزوں کے علاوہ مفکروں اور تصورات کے خالقوں کے طور پر بھی حکمرانی کرتے ہیں اور اپنے عہد کے خیالات کی پیداوار اور تقسیم کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے خیالات عہد کے حکمران خیالات ہوتے ہیں۔

سوال- تاریخ میں فرد کا کردار کیا ہے؟

جواب- مارکس ازم تاریخ میں فرد کے کردار کی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں کرتا بلکہ محض یہ وضاحت کرتا ہے کہ افراد یا پارٹیوں کے کردار کا احاطہ تاریخی ارتقاء کی معینہ سطح اور معروضی اور سماجی ماحول کرتا ہے جو آخری تجزیہ میں پیداواری قوتوں کی ترقی سے متعین ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے---- جیسا کہ مارکس ازم کے ناقدین کہتے ہیں---- کہ مرد و زن محض معاشی جبریت کی اندھی کارگزاریوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ مارکس اور اینگلز نے وضاحت کی تھی کہ مرد و زن اپنی

تاریخ خود بناتے ہیں لیکن وہ ایسا مکمل طور پر آزاد عاملین کے طور پر نہیں کرتے بلکہ جس قسم کے سماج میں وہ موجود ہوتے ہیں اس کی بنیاد پر انہیں کام کرنا پڑتا ہے۔ کسی دی گئی صورتحال میں سیاسی شخصیات کی ذاتی خصوصیات یعنی نظریاتی تیاری، مہارت ، ہمت و جرات اور ثابت قدمی نتائج پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ انسانی تاریخ میں ایسے فیصلہ کن لمحات بھی آتے ہیں۔ جب قیادت کا معیار ایسا فیصلہ کن کردار ادا کرسکتا ہے جس سے صورتحال کا پانسہ پلٹ جائے۔ ایسے ادوار عام نہیں ہوتے بلکہ یہ اسی وقت جنم لیتے ہیں جب ایسے طویل عرصے کے دوران پوشیدہ تضادات رفتہ رفتہ پختہ ہو جاتے ہیں اور جدلیات کی زبان میں مقدار معیار میں بدل جاتی ہے۔ اگرچہ افراد محض اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر سماج کے ارتقاء کا تعین نہیں کر سکتے تاہم انسانی تاریخ میں داخلی عنصر کا کردار فیصلہ کن ہوتا ہے۔

سوال- سماج کی مادی بنیادیں کیا ہیں؟

جواب- جس طرح ڈارون نے نامیاتی فطرت کا قانون ارتقاء دریافت کیا تھا۔ اسی طرح مارکس نے انسانی تاریخ کا قانون ارتقاء دریافت کیا۔ اس نے یہ سادہ حقیقت دریافت کی، جو نظریاتی جھاڑ جھنکار تلے چھپ چکی تھی، کہ سیاست، سائنس، مذہب اور فن وغیرہ کی جستجو سے پہلے انسان کیلئے کھانا، پینا، کپڑے اور رہائش ملنا ضروری ہے۔ لہذا گزر بسر کیلئے درکار ضروری مادی ذرائع کی پیداوار اور اس کے نتیجے میں کسی عہد میں کسی قوم کی حاصل کردہ معاشی ترقی کی سطح وہ بنیاد ہے جس پر ریاستی ادارے، قانونی تصورات، فن اور یہاں تک کہ متعلقہ قوم کے مذہبی خیالات ارتقاء پاتے ہیں۔ لہذا اسی کی روشنی میں ان چیزوں کی وضاحت ہونی چاہیے نہ کہ اس سے الٹ جیسا کہ اب تک ہوتا آیا ہے۔

سوال- سماجی ارتقاء کے قوانین کیا ہیں؟

جواب- سماجی پیداوار کے عمل کے دوران افراد ایسے مخصوص رشتوں میں بندھ جاتے ہیں جو ناگزیر ہوتے ہیں وہ ان کے ارادوں کے تابع نہیں ہوتے۔ یہ پیداواری رشتے پیداواری قوتوں کی ترقی کی مخصوص سطح سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ سماج کا معاشی ڈھانچہ انہی پیداواری رشتوں کے حاصل جمع پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر قانونی اور سیاسی بالائی ڈھانچے تعمیر ہوتے ہیں اور سماجی شعور کی مخصوص اقسام بھی اسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مادی زندگی کا مروجہ طریقہ پیداوار کے سماجی، سیاسی اور روحانی عوامل کے عمومی کردار کا تعین کرتا ہے۔ مردوزن کا شعور ان کے وجود کا تعین نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس ان کا سماجی وجود ان کے شعور کا تعین کرتا ہے۔ ارتقاء کے ایک مخصوص مرحلے پر یہ پیداواری رشتے سماج کی پیداواری قوتوں کے ارتقاء کی بجائے ان کے راستے کی دیوار بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد انقلاب کا دور شروع ہوتا ہے۔ معاشی تبدیلی آنے کے بعد سارا عظیم الشان بالائی ڈھانچہ بھی بالعموم بڑی تیزی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

ان تبدیلیوں کے حوالے سے جو فرق ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ معاشی حالات میں آنے والی مادی تبدیلی کا تعین فطری سائنس جیسی درستگی اور باریک بینی سے کیا جا سکتا ہے دوسری جانب قانونی، سیاسی، مذہبی، جمالیاتی یا فلسفیانہ نظریات وہ نظریاتی شکلیں یا ہیئتیں ہیں جن کے ذریعے انسان اس تصادم کے بارے میں شعور حاصل کرتے اور جدوجہد کرتے ہیں۔ جس طرح ہم کسی فرد کے بارے میں رائے اس بنیاد پر قائم نہیں کرتے کہ اس کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ اسی طرح ہم تبدیلی کے کسی عہد کو اس شعور کی بنیاد پر نہیں پرکھتے۔ اس کے

برعکس اس شعور کی وضاحت مادی زندگی کے تضادات' پیداوار کی سماجی قوتوں اور پیداواری رشتوں کے درمیان موجود تصادم کی کیفیت کے ذریعے کی جانی چاہیے۔ کوئی سماجی نظام اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک وہ تمام پیداواری قوتیں ترقی نہیں پا جاتیں جن کیلئے اس میں گنجائش موجود ہے اور نئے اور اعلیٰ پیداواری رشتے اس وقت تک کبھی نمودار نہیں ہوتے جب تک ان کے وجود کے مادی حالات پرانے سماج کی کوکھ میں پختہ ہو کر تیار نہیں ہو جاتے۔

انسان ہمیشہ اپنے ان مسائل سے الجھتا ہے جنہیں وہ حل کر سکتا ہو کیونکہ اگر ہم معاملے کا بغور جائزہ لیں تو ہمیشہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسئلہ صرف اس وقت سر اٹھاتا ہے جب اس کے حل کیلئے درکار ضروری مادی حالات پہلے سے وجود رکھتے ہوں یا کم از کم تشکیل کے مرحلے میں ہوں۔ ذرا وسعت میں دیکھیں تو ہم ایشیائی قدیم جاگیردارانہ اور جدید بورژوا طریقہ پیداوار کو سماج کی معاشی تشکیل کے ارتقاء کے مختلف ادوار کا نام دے سکتے ہیں۔ بورژوا پیداواری رشتے پیداوار کے سماجی عمل کی آخری مخاصمانہ شکل ہیں' انفرادی مخاصمت کے مفہوم میں نہیں بلکہ ایسی مخاصمت جو سماج میں رہنے والے فرد کی زندگی کا احاطہ کرنے والے حالات سے جنم لیتی ہے جبکہ ساتھ ہی ساتھ بورژوا سماج کی کوکھ میں ارتقاء پانے والی پیداواری قوتیں اسی مخاصمت کو دور کرنے کیلئے درکار مادی حالات پیدا کرتی ہیں لہٰذا یہ انسانی سماج کے قبل از تاریخی مرحلے کا آخری باب ہیں۔

سوال- سرمایہ دارانہ ارتکاز کا تاریخی رجحان کیا ہے؟

جواب- پیداکاروں کی بے دخلی بے رحمانہ اور تباہ کن غنڈہ گردی کے ذریعے سرانجام دی جاتی ہے اور یہ جذباتی محرکات انتہائی بدنام' غلیظ' گھٹیا اور قابل نفرت

کمینگی پر مبنی ہوتے ہیں ۔ دہقان اور دستکار کی خود کمائی ہوئی نجی ملکیت کی بنیاد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کی خود مختاری اور انفرادی محنت کے حالات کے ملاپ پر قائم ہوتی ہے ۔ اس کی جگہ سرمایہ دار بہت سے محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے ۔ یہ بے دخلی بذات خود سرمایہ دارانہ پیداوار کے داخلی قانون سے وقوع پذیر ہوتی ہے' ایک سرمایہ دار ہمیشہ بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتارتا ہے ۔ اس مرکزیت یا مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھوں بہت سے سرمایہ داروں کی بے دخلی کے ساتھ ساتھ عملی محنت کی امداد باہمی پر مبنی شکل' سائنس کا شعور' تکنیکی استعمال' زمین کی منظم کاشت' آلات محنت کی ایسے حالات میں تبدیلی جو صرف مشترکہ طور پر استعمال ہو سکتے ہوں' تمام ذرائع پیداوار کو مشترکہ سماجی محنت کے ذرائع کے طور پر استعمال کر کے با کفایت بنانے' تمام اقوام کو عالمی منڈی کے جال میں گرفتار کرنے اور اس کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کو بین الاقوامی کردار عطا کرنے کا کام بھی روز افزوں پیمانے پر فروغ پاتا ہے ۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی مسلسل کم ہوتی ہوئی تعداد کے پہلو بہ پہلو' جو تبدیلی کے اس عمل میں تمام مراعات پر غاصبانہ قبضہ اور اجارہ داری قائم کر لیتی ہے' وسیع پیمانے پر اذیت' جبر' غلامی' تذلیل اور استحصال بڑھتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ محنت کش طبقے کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے' وہ متحد اور منظم ہوتا ہے جس کی وجہ سرمایہ دارانہ پیداواری عمل کا اپنا میکانزم ہے ۔ سرمائے کی اجارہ داری جو اس طریقہ پیداوار کے ساتھ ساتھ اور اس کے تحت فروغ پائی اب اس کے راستے کی دیوار بن چکی ہے ۔ ذرائع پیداوار کی مرکزیت اور محنت کا سماجی کردار بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سرمایہ دارانہ خول سے ان کی مطابقت ختم ہو جاتی ہے اور یہ خول ٹوٹ جاتا ہے ۔ سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کی موت کا وقت آن

پہنچتا ہے۔ بے دخلی کرنے والے بے دخل کر دیے جاتے ہیں۔

سوال- گلوبلائزیشن کیا ہے؟

جواب- گلوبلائزیشن سے مراد مختلف ممالک کے درمیان معاشی تعلقات کا وہ پھیلاؤ ہے جس کے نتیجے میں ایک عالمی معیشت تخلیق ہوئی ہے۔ جس نے ہر قومی معیشت کو دیگر معیشتوں کا محتاج بنا دیا ہے۔ کوئی بھی ملک خود کفیل نہیں ہے۔ سب کو دوسرے ممالک کے ساتھ پیداواری اشیاء کے تبادلے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک مربوط عالمی معیشت بذات خود کوئی منفی چیز نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسی بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر ایک ہم آہنگ عالمی منصوبہ بندی پر مبنی معیشت پروان چڑھ سکتی ہے۔ ایک ایسے معاشی نظام کے تحت جس کی بنیاد سماجی انصاف اور ذرائع پیداوار (فیکٹریوں، ٹیکنالوجی، سرمایہ) کی اجتماعی ملکیت پر ہو۔ یہ عالمی انسانیت کیلئے ایک زبردست پیش رفت کا باعث بن سکتی ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت اور ہر انفرادی سرمایہ دار کی زیادہ سے زیادہ منافع کی ہوس کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ چیز ترقی کو ناممکن بنا کر ایک ایسی صورتحال پیدا کر دیتی ہے جس میں مٹھی بھر لوگ بے حد و حساب دولت جمع کر لیتے ہیں جبکہ کرہ ارض پر بسنے والے لوگوں کی اکثریت کا معیار زندگی کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

سوال- غربت اور عدم مساوات میں روز بروز اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟

جواب- اس وقت کرہ ارض پر چھ ارب انسان موجود ہیں جبکہ دس ارب انسانوں کیلئے خوراک پیدا کی جا سکتی ہے۔ تاہم بھوک، فاقہ کشی اور غربت و افلاس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ 80 کروڑ افراد غذائی کمی کا شکار ہیں جبکہ دو ارب چالیس کروڑ افراد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ مائیکروسافٹ کمپنی

کے تین اعلیٰ ترین عہدیداروں کے پاس اس قدر دولت موجود ہے جو امریکی حکومت کی طرف سے غربت کے خلاف جاری پروگراموں کیلئے مختص کردہ رقم سے زیادہ ہے۔مختلف معیشتوں کے درمیان اشیاء کا تبادلہ منصفانہ بنیادوں پر نہیں ہوتا۔مٹھی بھر ملٹی نیشنل کمپنیاں جو بے پناہ طاقت کی مالک ہیں زیادہ تر دولت پر قابض ہیں (کرہ ارض کی مجموعی داخلی پیداوار کا چالیس فیصد اور تجارت کا ستر فیصد) اور باقی دنیا پر اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے من مانی شرائط مسلط کرتی ہیں۔

عالمی معیشت کی تقسیم سے سبھی ممالک کو برابر کا فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک کو ترقی یافتہ ممالک اور عالمی اجارہ داریوں کے ہاتھ اپنا خام مال (تیل،معدنیات، زرعی اجناس) اور محنت انتہائی سستے داموں فراہم کرنا پڑتی ہیں۔اس عمل سے عدم مساوات کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی ہے۔غریب ممالک ایسی پیداواری اشیاء کے تبادلے پر مجبور ہوتے ہیں جن کی تیاری میں زیادہ محنت صرف ہوئی ہوتی ہے (تکنیکی پسماندگی کی وجہ سے) جبکہ ان کے عوض وہ ترقی یافتہ ممالک اور سامراجی اجارہ داریوں سے ایسی اشیاء لیتے ہیں جو مہنگی ہوتی ہیں جبکہ ان کی تیاری بہت آسان ہوتی ہے (ذرائع پیداوار کی معیاری اور مقداری حوالے سے اعلیٰ سطحی کے باعث)۔اس عمل میں کون کھوتا ہے اور کون پاتا ہے یہ بات بالکل واضح ہے۔علاوہ ازیں عالمی معیشت مغربی طاقتوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے زیر نگیں ہے اور وہ اپنی مرضی کی قیمتیں، تجارتی قوانین اور معاشی پالیسیاں باقی دنیا پر مسلط کر سکتی ہیں۔مثال کے طور پر 1960ء میں ایک امریکی ٹریکٹر خریدنے کیلئے تنزانیہ کو کافی کے دو سو تھیلے دینا پڑتے تھے۔تیس سال بعد ایک امریکی ٹریکٹر کی خریداری کیلئے تنزانیہ کو چھ سو سے زائد کافی کے تھیلے دینا پڑتے ہیں۔

سوال- ملٹی نیشنل کمپنیاں اتنی طاقتور کیوں ہیں؟

جواب- دنیا میں مٹھی بھر ملٹی نیشنل کمپنیوں کا غلبہ سرمایہ داری کے ارتقاء کا فطری نتیجہ ہے جو کہ زیادہ انفرادی منافع کی لالچ کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسے حاصل کرنے کیلئے سرمایہ دار مجبور ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں' اپنی پیداوار میں اضافہ کریں' فروخت بڑھائیں' نئی منڈیاں تلاش کریں اور موجودہ منڈیوں کے استحصال میں اضافہ کریں اور سستی محنت اور سستے خام مال کے حصول کیلئے نئے ممالک میں سرمایہ کاری کریں وغیرہ وغیرہ۔

نتیجے کے طور پر دولت چند ہاتھوں میں جمع ہوگئی ہے یعنی ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی مٹھی بھر بڑی بڑی کارپوریشنوں کے پاس جنہوں نے دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ جب ان کیلئے محض معاشی ذرائع سے اپنی شرائط منوانا ممکن نہیں رہتا تو ملٹی نیشنل کمپنیاں سامراجی ممالک کے سیاسی اور فوجی اداروں (امریکہ' یورپ اور جاپان جیسی بڑی طاقتوں کی حکومتوں' پارلیمانی' قوانین اور افواج) کو اپنے مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرتی ہیں۔

اکثر اوقات مفادات کو چھپانے کیلئے ''انسانیت کے مفادات'' کے دفاع کی آڑ میں مداخلت کرتی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں ہم یوگوسلاویہ' افغانستان اور عراق وغیرہ میں اسی قسم کی 'انسانی بہبود کیلئے کی جانے والی بمباریوں' کے نمونے دیکھ چکے ہیں۔ جنہیں بذات خود بڑی طاقتوں نے تخلیق کیا تھا اور وہی ان پر غالب ہیں۔ (عالمی مالیاتی فنڈ' عالمی بینک' نیٹو' اقوام متحدہ وغیرہ)

گلوبلائزیشن اس نظام کی حقیقی نوعیت کو چھپانے کیلئے نقاب کا کام کرتی ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی تعریف کیلئے جس کا خاصہ بین الاقوامی سطح پر محنت کش

طبقے اور دنیا بھر کی اقوام کا چند طاقتوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھوں استحصال ہے' سامراج سے بہتر کوئی اصطلاح نہیں۔

سوال- کیا یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری سے لڑے بغیر عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کے خلاف لڑا جائے؟

جواب- یہ غیر مساویانہ تبادلہ جس نے غریب ممالک کو غربت اور افلاس کی دلدل میں دھکیل دیا ہے انہیں بڑی طاقتوں یا ان کے تخلیق کردہ مالیاتی اداروں (عالمی مالیاتی فنڈ' عالمی بینک وغیرہ) سے قرضے لینے پر مجبور بھی کرتا ہے جس سے وہ مکمل طور پر غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے قرضوں کی وجہ سے وہ قرضے دینے والے اداروں کی جانب سے ان پر مسلط کئے جانے والے معاشی منصوبوں اور بین الاقوامی تعلقات کو قبول کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ عالمی مالیاتی فنڈ' عالمی بینک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن جیسے تمام ادارے سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ بڑی طاقتیں اور ملٹی نیشنل کمپنیاں ان اداروں کو محض اسی وجہ سے رقوم فراہم کرتی ہیں کیونکہ ان اداروں پر انہی کا غلبہ ہے اور وہ ہی ان کی پالیسیوں کا تعین کرتی ہیں۔ ان اداروں کی اصلاح کرنا یا ان کو جمہوری بنانا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ اگر یہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کیلئے سودمند نہ رہے تو وہ انہیں رقوم کی فراہمی بند کر کے نئے ادارے تخلیق کر لیں گے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طاقت کی بنیاد ذرائع پیداوار پر ان کا قبضہ اور ملکیت ہے یعنی مشینری' فیکٹریوں' زمینوں اور سرمائے کی ملکیت۔ جب تک ان طفیل خوروں کو بے دخل کر کے ان کی دولت کو عوام کے جمہوری کنٹرول میں نہیں دیا جاتا موجودہ صورتحال کی اصلاح کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔

سوال- سیاٹل، پراگ، اور وینس وغیرہ میں مظاہروں کی کیا وجوہات تھیں؟

جواب- عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کی جانب سے نام نہاد ''امداد'' حاصل کرنے والے ممالک پر جو پالیسیاں مسلط کی جاتی ہیں وہ وہی ہیں جو دنیا بھر کے سرمایہ دار اپنے منافعوں میں اضافے کیلئے کرتے ہیں یعنی ریاست کی جانب سے فراہم کی جانے والی تعلیم اور صحت عامہ کی سہولتوں پر حملہ، اجرتوں میں کمی، چھانٹیاں، پینشنوں اور دیگر مراعات میں کمی، لیبر قوانین میں اصلاحات، پبلک سیکٹر میں چلنے والی کمپنیوں کی نجکاری وغیرہ۔ غریب ترین ممالک میں ان پالیسیوں پر اور بھی زیادہ تیز رفتاری سے عمل درآمد ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھوں ان کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں امیر اور غریب کے درمیان خلیج وسیع ہوتی ہے۔ غربت میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور دنیا بھر میں ماحول کی تباہی کا سلسلہ اور آگے بڑھتا ہے۔ یہ مظاہرے جن کی شروعات سیاٹل سے ہوئی تھی اور اب ہر اس شہر میں دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں عالمی مالیاتی فنڈ، عالمی بینک یا دیگر بین الاقوامی اداروں کے اجلاس منعقد ہو رہے ہوں۔ یہ درحقیقت نوجوانوں اور محنت کشوں کے بڑھتے ہوئے غم و غصے اور مزدور بین الاقوامیت کی غمازی کرتے ہیں۔

سوال- کیا ایک مختلف قسم کے سماج کا قیام ممکن ہے؟

جواب- دنیا بھر میں عالمی مالیاتی فنڈ اور دیگر سامراجی اداروں کے خلاف ہونے والے مظاہرے ان کی پالیسیوں کی عالمی مخالفت کی علامت ہیں۔ لیکن اگر ہم ان ناانصافیوں کا مکمل خاتمہ چاہتے ہیں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی سطح پر ایک مستقل اور زبردست جدوجہد منظم کی جائے جس میں مزدور تحریک بھی شامل ہو

اوراس کے ذریعے سماج کی انقلابی تبدیلی روبہ عمل میں لائی جاسکے۔

یہ جدوجہد محض کسی ملٹی نیشنل کے خلاف احتجاج یا کسی ادارے (چاہے وہ عالمی مالیاتی فنڈ ہو یا ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) کی بندش کی کوشش تک محدود نہیں رہ سکتی۔ ہمارا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ سرمایہ داری کو بطور ایک نظام کے ختم کردیا جائے۔ بینکوں اور بڑی اجارہ دار کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی جمع کردہ دولت کو قبضے میں لے کر عالمی معیشت کی منصوبہ بندی کے تحت استوار کیا جائے۔ جسے تمام محکوم عوام کی شرکت سے جمہوری انداز میں چلایا جائے تاکہ وہ چند لوگوں کے منافع کی ہوس پوری کرنے کے بجائے انسانوں کی اکثریت کی ضروریات پوری کرسکے۔ ایک حقیقی سوشلسٹ سماج (سوویت یونین میں ناکام ہونے والا مسخ شدہ نوکر شاہانہ نظام نہیں) ہی واحد متبادل ہے۔ یہ صرف ممکن ہی نہیں ضروری بھی ہے۔

یہ انقلابی تبدیلی صرف محنت کش طبقے (سماج کا سب سے بڑا طاقتور طبقہ جو پیداوار روک کر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طاقت کا بھرم دنوں میں کھول سکتا ہے) کی سربراہی میں اٹھنے والی ایک ایسی انقلابی تحریک کے ذریعے ہی ممکن ہے جس میں سماج کے وہ تمام حصے بھی شامل ہوں جو اس سرمایہ دارانہ جبر کا شکار ہو رہے ہیں۔

سوال- لوگوں کی اس سے کیا مراد ہوتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہیں؟

جواب- مارکسی اصطلاح میں، سوشلزم، سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کے درمیان ایک عبوری دور کے طور پر تصور کیا جاتا ہے۔ ایک ایسے نظام تک عبوری سفر، جس میں ہم حقیقی معنوں میں "ہر کسی سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق، اور ہر کسی کو

اس کی ضرورتوں کے مطابق'' کا رشتہ قائم کرسکیں۔اس لئے حقیقی مارکسسٹ کو متبادل کے طور پر سوشلسٹ بھی کہا جا سکتا ہے' تاوقتیکہ ان کا ہدف سرمایہ دارانہ نظام کا انہدام اور حقیقی محنت کشوں کے کنٹرول پر مبنی جمہوری سوشلزم کی تعمیر ہو۔

سوال- کیا یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری سے لڑے بغیر کسی ایک ادارے یا فرد کے خلاف لڑا جائے؟

جواب- یہ غیر مساوی نظام جس نے غریب محنت کش کو غربت اور افلاس کی دلدل میں دھکیل دیا اور انہیں بڑی طاقتوں یا ان کے تخلیق کردہ اداروں کا مقروض کر دیا ہے جس سے وہ مکمل طور پر غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔اپنے حالات کی وجہ سے وہ ان اداروں کی جانب سے ان پر مسلط کئے جانے والے منصوبوں اور قوانین کو قبول کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔یہ تمام ادارے سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ان اداروں کی اصلاح کرنا یا ان کو جمہوری بنانا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ اگر یہ ادارے سودمند نہ رہے تو ان کی جگہ نئے ادارے تخلیق کر لئے جائیں گے۔حکمرانوں کی طاقت کی بنیاد ذرائع پیداوار پر ان کا قبضہ اور ملکیت ہے یعنی مشینری' فیکٹریوں' زمینوں اور سرمائے کی ملکیت۔جب تک ان طفیل خوروں کو بے دخل کر کے ان کی دولت کو عوام کے جمہوری کنٹرول میں نہیں دیا جاتا موجودہ صورتحال کی اصلاح کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔

سوال- انقلاب کیا ہے؟

جواب- باقی تمام تاریخ کی طرح انقلاب کی تاریخ کو سب سے پہلے تو یہ بتانا چاہیے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔تاہم یہ بات انتہائی ناکافی ہے۔بیان سے ہی یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ جو کچھ ہوا وہ اسی طرح کیوں ہوا کسی اور طرح کیوں نہیں

ہوا۔ واقعات کو نہ تو مہم جوئی کا ایک سلسلہ خیال کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں پہلے سے طے شدہ انجام یا سبق کی لڑی میں پروئے ہوئے دانے سمجھا جا سکتا ہے۔ انہیں لازمی طور پر اپنے قوانین کے تابع ہونا چاہیے۔

عوام کی تاریخی واقعات میں براہ راست مداخلت انقلاب کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ عام ادوار میں ریاست' چاہے وہ مطلق العنان ہو یا جمہوری' خود کو قوم سے بلند کر لیتی ہے اور تاریخ ایسے ماہرین بناتے ہیں جن کا یہ کام ہے۔ مثلاً بادشاہ' وزراء' بیوروکریٹ اور ممبران پارلیمنٹ۔ لیکن ایسے فیصلہ کن لمحات میں جب پرانا نظام عوام کیلئے قابل برداشت نہیں رہتا تو وہ تمام رکاوٹیں توڑتے ہوئے ان حضرات کو سیاسی اکھاڑے سے خارج کر دیتے ہیں۔ اپنے روایتی نمائندوں کو ایک طرف ہٹا دیتے ہیں اور اپنی براہ راست مداخلت کے ذریعے ایک نئے نظام کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ ہم اخلاقیات پرستوں پر چھوڑتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم حقائق کو اسی طرح لیں گے جس طرح ارتقاء کا معروضی راستہ ہمیں مہیا کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک انقلاب کی تاریخ سب سے بڑھ کر عوام کے اپنے مقدر کو خود اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے تاریخ کے میدان میں پرزور مداخلت کی تاریخ ہے۔

سوال- انقلابی پارٹی کیا ہوتی ہے؟

جواب- ایک پارٹی محض ایک تنظیمی ہیئت' ایک نام' ایک جھنڈا' افراد کا مجموعہ یا مشینری نہیں ہوتی۔ کسی مارکسسٹ کیلئے ایک انقلابی پارٹی پہلے ایک پروگرام' طریقہ ہائے کار' تصورات اور روایت ہوتی ہے اور پھر کہیں دوسرے درجے پر ایک تنظیم اور ایک مشینری ہوتی ہے (اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی اہم ہوتی

ہیں) تا کہ ان تصورات کو محنت کش طبقے کی وسیع تر پرتوں تک پہنچایا جا سکے۔ مارکسی پارٹی کیلئے ضروری ہے کہ وہ شروع ہی سے نظریہ اور پروگرام کی بنیاد بنائے جو پرولتاریہ (محنت کش طبقہ) کے مجموعی تاریخی تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انقلابی پارٹی کی تعمیر کے کام کا آغاز ہمیشہ کیڈروں کو جمع کرنے اور ان کی تعلیم اور تربیت کرنے سے ہوتا ہے جو پارٹی کی ساری زندگی کے دوران ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتے ہیں۔ یہ مسئلے کا پہلا حصہ ہے لیکن صرف پہلا حصہ۔ دوسرا حصہ زیادہ پیچیدہ ہے: محنت کشوں کی اکثریت تک اپنا پروگرام اور تصورات کیسے پہنچائے جائیں۔

سوال- انقلابی پارٹی کیوں ضروری ہوتی ہے؟

جواب- کسی مارکسی رجحان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مزدور تحریک کے وسیع تجربہ کو عمومی اصولوں کی شکل دیتے ہوئے محنت کش طبقے کی اجتماعی یاداشت کا کام کرے۔ تحریک کے اندر ایک علیحدہ رجحان کے طور پر ہمارے وجود کا کوئی اور جواز نہیں ہوسکتا۔ اگر محنت کش طبقہ کو سماج تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو ایک ایسی پارٹی کی تعمیر کا وقت طلب کام انتہائی ضروری ہے۔ انقلابی مواقع غیر معینہ عرصے کیلئے نہیں ہوتے۔ اگر محنت کش طبقہ سماج کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو ناگزیر طور پر حکمران طبقہ اپنے نظام کے دفاع میں اسے کچل ڈالتا ہے۔ بدقسمتی سے محنت کش طبقے کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کی کوششوں کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے مثال کے طور پر چلی میں 1972-73ء کے دوران ایک انقلابی پارٹی راتوں رات وجود میں نہیں آ سکتی تھی۔ یہی کیفیت ہمیں 1968-69ء میں پاکستان میں ملتی ہے۔ اسے شعوری طور پر تعمیر کرنا ضروری ہے

اور اس کی تعمیر بین الاقوامی سطح پر مزدور تحریک کی جدوجہد اور پہلے سے موجود تنظیموں، پارٹیوں اور یونینوں کے اندر کی جانی چاہیے۔ انقلابی پارٹی اور قیادت کی موجودگی طبقاتی جدوجہد کے نتیجے پر اسی طرح فیصلہ کن انداز میں اثر انداز ہوتی ہے جس طرح قوموں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں فوج اور جنرل سٹاف کا معیار فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ جس طرح جنگ کے آغاز پر جنرل سٹاف کو فوری طور پر معرض وجود میں نہیں لایا جا سکتا اسی طرح انقلابی پارٹی کو بھی عین موقع پر تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ اسے سالوں اور دہائیوں تک منظم طریقہ سے تعمیر کرنا پڑتا ہے۔ ساری تاریخ اور بالخصوص بیسویں صدی کی تاریخ ہمیں یہی سبق سکھاتی ہے۔ محنت کش طبقے کی شہید اور عظیم انقلابی روزا لکسمبرگ ہمیشہ اس بات پر زور دیتی تھی کہ عوام کی انقلابی پہل قدمی انقلاب کی قوت متحرکہ ہے۔ اور اس کی بات بلکہ درست ہے۔ انقلاب کے دوران عوام بہت تیزی سے سیکھتے ہیں۔ لیکن انقلابی کیفیت کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکتی۔ سماج کو ایک مستقل ابھار کی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ ہی محنت کش طبقہ کو مستقل طور پر شدید سرگرمی کی کیفیت میں رکھا جا سکتا ہے۔ نہ تو تجربات کیلئے وقت ہوتا ہے اور نہ ہی محنت کشوں کے پاس ٹامک ٹوئیاں مار کر سیکھنے کا وقت ہوتا ہے۔ جب زندگی موت کا مسئلہ پیش ہو تو غلطیوں کی بہت بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ عوام کی ''خودرو'' تحریک کو تنظیم، پروگرام، پیش منظر، حکمت عملی اور طریقہ کار یعنی ایک انقلابی پارٹی کے ساتھ جوڑا جائے جس کی باگ دوڑ تجربہ کار کیڈرز کے ہاتھ میں ہو۔ سرمایہ داری نظام خود بخود تباہ نہیں ہوگا اور اس کا ہر بحران ہمارے لئے دشواریاں لے کر آئے گا۔ صرف بین الاقوامی سطح پر محنت کشوں کی شعوری جدوجہد اور انقلابی

قیادت کی تعمیر ہی سرمایہ داری کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک سکتی ہے۔اس لئے بلاشبہ کسی بغاوت کی نہیں بلکہ محنت کش طبقہ یعنی سماج کی اکثریت کی شعوری تحریک کی ضرورت ہے۔ہم سب مختلف ہیں اور یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ سب لوگ راتوں رات خودکار طریقہ سے ایک ہی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے اور صبح اٹھتے ہی مل کر انقلاب کردیں گے۔ہم سب مختلف اوقات پر مختلف واقعات سے سیکھتے ہیں۔ایک انقلابی رجحان کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے سماج کو تبدیل کرنے کا فریضہ سرانجام دیا جاسکے۔

سوال۔کمیونسٹ مینی فیسٹو نے سیاسی جدوجہد کے طریقہ ہائے کار کے بارے میں کیا بنیادی مارکسی اصول پیش کیا تھا؟

جواب۔''کمیونسٹ فوری مقاصد کے حصول کیلئے'محنت کش طبقے کے ہنگامی مفادات کے حصول کیلئے لڑتے ہیں لیکن حال کی تحریک میں وہ مستقبل کی تحریک کا خیال رکھتے ہیں اور اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

کمیونسٹ'مزدور طبقے کی دوسری پارٹیوں کے خلاف کوئی الگ پارٹی نہیں بناتے۔بحیثیت مجموعی پرولتاری طبقے کے مفاد کے سوا ان کا کوئی مفاد نہیں۔وہ اپنے جداگانہ فرقہ پرور اصول قائم نہیں کرتے'جس سے مزدور تحریک کو کوئی خاص شکل دی جائے اور کسی خاص سانچے میں ڈالا جائے۔کمیونسٹوں کا امتیاز مزدور طبقے کی دوسری پارٹیوں سے صرف یہ ہے کہ(1)مختلف ملکوں کے مزدوروں کی قومی جدوجہد میں وہ بلا امتیاز قومیت پورے مزدور طبقے کے مشترک مفاد پر زور دیتے اور ان کو نمایاں کرتے ہیں۔(2)بورژوا طبقے کے خلاف مزدور طبقے کی جدوجہد اپنی نشوونما کے جن مرحلوں سے گزرتی ہے ان میں وہ ہر جگہ اور ہمیشہ بحیثیت مجموعی پوری تحریک

کے مفاد کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کمیونسٹوں کا فوری مقصد وہی ہے جو مزدوروں کی سب ہی دوسری پارٹیوں کا، یعنی یہ کہ مزدوروں کا ایک طبقہ بنے، بورژوا طبقے کا غلبہ ختم کیا جائے اور پرولتاریہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کرے۔ کمیونزم کی امتیازی صفت عام طور پر ملکیت کو نہیں بلکہ بورژوا ملکیت کو مٹانا ہے۔ مزدوروں کا کوئی وطن نہیں۔ اور جو ان کے پاس ہے نہیں اسے ان سے کون چھین سکتا ہے۔

سوال- سوشلزم کے ناگزیر ہونے کے بارے میں مارکس کی کیا رائے تھی؟

جواب- مارکس سرمایہ دارانہ سماج کی سوشلسٹ سماج میں تبدیلی کے ناگزیر ہونے کا جو نتیجہ اخذ کرتا ہے وہ خالصتاً رائج الوقت سماج کے ارتقاء کے معاشی قانون کے تحت ہے۔ مارکس کی وفات کے بعد پچاس برسوں میں محنت کی سماجی شکل نے تیز رفتاری سے ترقی کی ہے اور ہزاروں روپ اختیار کر کے اپنا اظہار بہت واضح طور پر کیا ہے۔ بڑے پیمانے کی پیداوار میں اضافہ، سنڈیکیٹ اور ٹرسٹوں کے ساتھ ساتھ مالیاتی سرمائے کی قوت اور وسعت میں جو بے پناہ اضافہ ہوا ہے وہ سوشلزم کے ناگزیر ظہور کیلئے کلیدی مادی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس تبدیلی کی فکری اور اخلاقی قوت محرکہ اور اسے عملی جامہ بنانے والا طبقہ پرولتاریہ جس کی تربیت بذات خود سرمایہ داری نے کی ہے۔ سرمایہ دار طبقے کے خلاف محنت کش طبقے کی جدوجہد بہت سی شکلیں اختیار کرتی ہیں اس کا آغاز معاشی جدوجہد سے ہوتا ہے اور بالآخر سیاسی شکل اختیار کرتی ہے۔ جس کا مقصد سیاسی اقتدار پر پرولتاریہ کی فتح ہوتا ہے۔ پیداوار کی سماجی شکل اختیار کر جانے سے لازمی طور پر ذرائع پیداوار سماج کی ملکیت بن جائیں

گے یعنی ’’ بے دخل کرنے والوں کی بے دخلی عمل میں آئے گی ۔‘‘اس تبدیلی کے براہ راست نتیجے کے طور پر محنت کشوں کی پیداواری کارکردگی میں زبردست اضافہ ہوگا‘ اوقات کار کم ہو جائیں گے اور چھوٹے پیانے کی صنعت کی باقیات کی پسماندہ اور بکھری ہوئی پیداوار کی جگہ اجتماعی اور بہتر محنت لے لے گی ۔ سرمایہ داری صنعت اور زراعت کے بندھن کو توڑتی ہے ۔ سوشلزم انتہائی ترقی یافتہ ہونے کے باوجود ان بندھنوں کو ازسرنو استوار کرنے کیلئے نئے عناصر تیار کرتا ہے۔صنعت اور زراعت کے درمیان اجتماعی محنت کو یکجا کر کے اور سائنس کا شعوری اطلاق کر کے اتحاد قائم کرتا ہے اور انسانی آبادی کو ازسرنو تقسیم کرتا ہے۔(اس طرح وہ دیہی پسماندگی علیحدگی اور بربریت کے ساتھ ساتھ بڑے شہروں میں عوام کی وسیع اکثریت کے غیر فطری اجتماع کا بھی خاتمہ کرتا ہے ۔)موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی اعلیٰ ترین شکلوں نے ایک نئے قسم کے خاندان‘ عورت کی حیثیت اور نئی نسل کی پرورش کے حوالے سے نئے حالات پیدا کیے ہیں ۔جدید سماج میں سرمایہ داری کے ہاتھوں عورتوں اور بچوں کی محنت کا استحصال اور خاندان کی ٹوٹ پھوٹ ناگزیر طور پر انتہائی خوفناک‘ تباہ کن اور مکروہ شکلیں اختیار کرتی ہے۔تاہم جدید صنعت پیداوار کے سماجی انداز میں منظم عمل میں خاندانی حلقے سے باہر عورتوں‘ نوجوانوں اور دونوں جنسوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو جو اہم کردار سونپتی ہے اس سے جنسوں کے تعلق اور خاندان کی ایک اعلیٰ شکل کی ایک نئی معاشی بنیاد ضرور فراہم ہوتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ خاندان کی ٹیوٹونک عیسائی ہیت کو حتمی اور کامل خیال کرنا اس قدر بے ہودہ بات ہے جتنی قدیم روم‘ قدیم یونان یا مشرقی ہیتوں کو جو کہ اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو تاریخی ارتقا کے سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔علاوہ ازیں یہ بات بھی بالکل واضح

ہے کہ حقیقت میں اجتماعی طور پر محنت کرنے والوں کا گروہ ہر دو جنسوں اور ہر عمر کے افراد پر مشتمل ہونے کے باعث مناسب حالات میں لازمی طور پر انسانی ترقی کا سرچشمہ بن جاتا ہے اگر چہ خودرو اور وحشیانہ سرمایہ دارانہ شکل میں جہاں محنت کش پیداوار کے عمل کی خاطر زندہ رہتا ہے نہ کہ پیداوار کا عمل محنت کش کیلئے ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بدعنوانی اور غلامی کی بیماری کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

سوال- تاریخ کا مادی تصور کیا ہے؟ (لینن کی وضاحت)

جواب- پرانی مادہ پرستی غیر مکمل، غیر مستقل مزاج اور یک طرفہ ہے اور اس سماج کی سائنس کو مادی بنیادوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور پھر ان پر اس سائنس کو از سر نو تشکیل دینے کی ضرورت ہے چونکہ مادہ پرستی کے نقطہ نظر سے شعور کو ذات کا اظہار قرار دیا جاتا ہے نہ کہ اس سے الٹ۔ اس لئے جب ہم مادہ پرستی کے نقطہ کا اطلاق انسانوں کی سماجی زندگی پر کرتے ہیں یہ بات سامنے آتی ہے کہ سماجی شعور سماجی ہستی کا نتیجہ یا اظہار ہے۔ انسان فطرت کے ساتھ کس انداز سے نبرد آزما ہے یعنی پیداوار کا وہ عمل جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھتا ہے اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس کے سماجی تعلقات کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے اور ان کے نتیجے میں کس قسم کے ذہنی تصورات و افکار جنم لیتے ہیں۔ انسانی سماج اور اس کی تاریخ پر مادی نقطہ نظر کے بنیادی اصولوں کے اطلاق کو بہت جامع انداز میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ:

''اپنی زندگیوں کی سماجی پیداوار کے دوران افراد ایک دوسرے کے ساتھ ایسے رشتوں میں بندھ جاتے ہیں جو ناگزیر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشات کے تابع بھی نہیں ہوتے۔ یعنی وہ پیداواری رشتے جو مادی پیداواری قوتوں کی ترقی

کی اس مخصوص سطح سے میل کھاتے ہیں"۔

"سماج کا معاشی ڈھانچہ انہی پیداواری رشتوں کے حاصل جمع پر مشتمل ہوتا ہے یہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر ایک قانونی اور سیاسی بالائی ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے اور سماجی شعور کی مخصوص ہیئتیں بھی اسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مادی زندگی کی پیداوار کا طریقہ ہی سماجی، سیاسی اور فکری زندگی کے عمل کا تعین کرتا ہے۔"

تاریخ کے مادی تصور کی دریافت کے باعث یا زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا جائے تو مادیت (فلسفیانہ مادیت) کے سماجی مظاہرے کے دائرے تک تسلسل کے ساتھ وسعت اختیار کر جانے کی وجہ سے پہلے سے رائج تاریخ سے متعلق تھیوریوں میں موجود دو بڑے نقائص کا خاتمہ ہو گیا۔ اول یہ کہ وہ زیادہ سے زیادہ محض انسانوں کی تاریخی سرگرمیوں کے نظریاتی محرکات کا احاطہ کرتی تھیں لیکن ان محرکات کی بنیادوں کے سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں کرتی تھیں، نہ ہی وہ سماجی رشتوں کے نظام کے ارتقاء میں کارفرما معروضی قوانین کا تعین کرتی تھیں اور نہ ہی وہ اس بات کو مدنظر رکھتی تھیں کہ ان رشتوں کا دارومدار اس امر پر ہوتا ہے کہ مادی پیداوار کی ترقی کی سطح کیا ہے۔ دوم، یہ ابتدائی تھیوریاں آبادی کی اکثریت پر مشتمل عوام کی سرگرمیوں کا احاطہ نہیں کرتی تھیں۔ جب کے تاریخی مادیت کے ذریعے عوامی زندگی کے سماجی حالات اور ان میں تبدیلی کا سائنسی درست مطالعہ پہلی بار ممکن ہوا۔

مارکسزم سے پہلے کی سوشیالوجی اور تاریخ نویسی ادھر ادھر سے جمع کردہ خام حقائق کا مجموعہ اور تاریخی عمل کے انفرادی پہلوؤں کی منظر کشی سے زیادہ کچھ نہیں تھیں۔ مختلف رجحانات کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینے کے بعد انہیں تاریخی عمل کے انفرادی پہلوؤں میں سرگرم عمل مختلف طبقات کی پیداوار اور حالات زندگی کی انتہائی

درست تعریفوں میں لیا گیا۔ اسی مخصوص ''غالب'' تصور یا اس کی تشریح کے انتخاب کا جائزہ لینے کے بعد اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا کہ تمام تصورات و افکار اور مختلف رجحانات پیداوار کی مادی قوتوں کے حالات سے جنم لیتے ہیں۔ یوں مارکس ازم نے سماجی اور معاشی نظاموں کے ظہور، عروج اور زوال کے عمل کے جامع مطالعہ کیلئے راستہ ہموار کر دیا۔ لوگ اپنی تاریخ خود بناتے ہیں لیکن لوگوں کے، عوام کی اکثریت کے متحرکات کا تعین کون سی چیز کرتی ہے یعنی انسانی سماجوں میں جاری ان تمام تضادموں کا حاصل جمع کیا ہے؟ انسان کی تمام تر تاریخی سرگرمی کی بنیاد بننے والے مادی زندگی کی پیداوار کے معروضی حالات و شرائط کیا ہیں؟ ان حالات کے ارتقاء کا قانون کیا ہے؟ مارکس نے ان تمام باتوں کی جانب توجہ دلاتے ہوئے تاریخ کے سائنسی مطالعہ کا راستہ دکھایا جس کی روح سے تمام تر تنوع اور تضادات کے باوجود یہ ایک ہی عمل ہے اور مخصوص قوانین کے تابع ہے۔

سوال- مارکسزم کا فلسفہ (جدلیاتی مادیت) کیا ہے؟

جواب- جدلیات نہ تو فکشن ہے اور نہ ہی تصوف۔ اگر اسے زندگی کے عام مسائل تک محدود نہ رکھا جائے تو یہ ایک سائنس ہے جس کے ذریعے پیچیدہ اور طویل اعمال کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جدلیات اور رسمی منطق میں وہی رشتہ ہے جو بالائی اور زیریں ریاضیات میں ہوتا ہے۔

ارسطو کی عام قضیے کی منطق یوں شروع ہوتی ہے کہ الف برابر ہے الف کے۔ اس مفروضے کو بے شمار انسانی اعمال کیلئے قبول کر لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں الف الف کے برابر نہیں ہوتا۔ اگر ان دونوں حرفوں کو محدث شیشے کے نیچے رکھ کر دیکھا جائے تو مذکورہ بالا بات آسانی سے ثابت ہو جائے گی۔ وہ ایک دوسرے سے

مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ فقط ایک جیسی مقدار کا استعادہ ہیں۔مثلاً ایک پونڈ چینی۔اصل میں ایک پونڈ چینی ایک پونڈ نہیں ہوتی۔ ایک زیادہ عمدہ پیمانہ فرق کو واضح کر دے گا۔ یہ بھی درست ہے کہ تمام اجسام مداخلت کے بغیر اپنا حجم، وزن اور رنگ وغیرہ بدل دیتے ہیں۔ وہ خود میں برابر نہیں ہوتے۔ایک سوفطائی کہے گا کہ ایک خاص لمحے میں ایک پونڈ چینی ایک پونڈ وزن کے برابر ہوتی ہے۔

اگر اس انتہائی مشکوک قضیے کی عملی قدر کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تو پھر بھی یہ نظریاتی تنقید کو برداشت نہیں کر سکے گا۔مثلاً ہم لفظ ''لمحہ'' کو حقیقی طور پر کیسے تصور میں لا سکیں گے۔اگر یہ وقت کا ایک لامتناہی عرصہ ہے تو پھر اس مدت میں وہ ''لمحہ'' ناگزیر طور پر تغیر کا مرہون منت ہوگا۔یا پھر کیا ''لمحہ'' کوئی خالص ریاضیاتی تجرید ہے؟ یعنی وقت کا صفر۔لیکن ہر شے وقت کے اندر موجود ہے۔اور موجودگی بذات خود تبدیلی کا مداخلت کے بغیر ایک عمل ہے۔نتیجے کے طور پر ہر وقت موجودگی کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ لہذا الف برابر الف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز اپنے ہی برابر ہوتی ہے بشرطیکہ وہ تبدیل نہ ہو لیکن اگر وہ تغیر پذیر نہیں ہوگی تو موجود بھی نہیں ہوگی۔

پہلی نظر میں یہ ''باریکیاں'' بے سود لگتی ہیں مگر حقیقت میں یہ فیصلہ کن اہمیت کی مالک ہوتی ہیں ایک طرف الف برابر الف کا قضیہ ہمارے تمام علم سے جدا ہونے کا نکتہ لگتا ہے مگر دوسری طرف یہ نکتہ ہمارے علم کی تمام غلطیوں کو ظاہر کرتا ہے۔کسی غلطی کے بغیر الف برابر الف کے قضیے کو استعمال کیا جا سکتا ہے مگر بعض حدود کے اندر رہ کر جب زبردست کام کے دوران الف میں مقداری تبدیلیاں نہ ہونے کے برابر ہوں

تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ الف برابر الف کے ہے۔مثال کے طور پر اسی طریقے سے ایک پونڈ چینی فروخت کرنے اور خریدنے والے کے مابین لین دین طے ہوتا ہے اسی طرح سورج کا درجہ حرارت متعین کیا جاتا ہے کچھ عرصہ پہلے تک ڈالر کی قوت خرید کا تعین بھی یونہی ہوتا تھا۔لیکن مقداری تبدیلیاں بعض حدود سے پرے معیاری تبدیلیوں میں بدل جاتی ہیں ایک پونڈ چینی پانی یا مٹی کے تیل سے مل کر ایک پونڈ چینی نہیں رہتی۔جب ایک ڈالر صدر کی جیب میں ہوتا ہے تو وہ ایک ڈالر نہیں رہتا۔ کس نازک وقت پر مقدار معیار میں تبدیل ہو جاتی ہے اس لمحے کا تعین عمرانیات سمیت علوم کے تمام شعبوں کیلئے بے حد اہم اور مشکل کام ہے۔

ہر کاریگر جانتا ہے کہ وہ دو چیزیں ایک جیسی نہیں بنا سکتا۔پیتل کی سلاخ میں کچھ ردو بدل کر کے اس سے کون بنائی جاتی ہے یہ ردو بدل ایک حد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ (اسے برداشت کہتے ہیں) اس برداشت کو مدنظر رکھتے ہوئے خیال کیا جاتا ہے کہ تمام کونیں ایک جیسی ہیں (یعنی الف برابر ہے الف کے) جب یہ ''برداشت'' بڑھ جاتی ہے تو مقدار معیار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کون خراب ہو کر بے قیمت رہ جاتی ہے۔

ہماری سائنسی سوچ ہمارے عام عمل کا ایک حصہ ہوتی ہے جس میں تیکنیک بھی شامل ہے جہاں تک نظریات کا تعلق ہے اس کیلئے بھی ''برداشت'' کی ضرورت ہے جو الف برابر کے قضیے سے معرض وجود میں نہیں آتی بلکہ اس قضیے کی جدلیاتی منطق سے جنم لیتی ہے کہ ہر چیز ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔ عقل عامہ کی خوبی اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ یہ بتدریج ''برداشت'' سے آگے نکل جاتی ہے۔

سرمایہ داری' اخلاقیات' آزادی' مزدور ریاست جیسے نظریات کے ساتھ کوئی

بیہودہ قسم کا خیال بھی گہری تجریدات کی طرح بندھا ہوتا ہے۔ یعنی سرمایہ داری سرمایہ داری کے برابر ہے۔ اخلاقیات اخلاقیات کے برابر ہے وغیرہ۔ لیکن جدلیاتی سوچ چیزوں کو ان کے مسلسل تغیر کے تناظر میں دیکھتی ہے اور مادی حالات میں ان تبدیلیوں کا تعین کرتی ہے جن کی حد سے ماورا الف الف نہیں رہتا۔ ایک مزدور ریاست ریاست نہیں رہتی۔

بیہودہ خیال کی بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ حقیقت کو بے حرکت سمجھتا ہے حالانکہ حقیقت ازلی حرکت پر مشتمل ہے۔ جدلیاتی سوچ ممکن حد تک نظریات کو درستگی' جامعیت' لچک اور بہتر مواد مہیا کرتی ہے بلکہ ایک شادابی جو نظریات کو ایک حد تک عملی زندگی کے قریب لے آتی ہے۔ عام سرمایہ داری نہیں بلکہ ترقی کے کسی خاص مرحلے کی سرمایہ داری' عام مزدور ریاست نہیں بلکہ سامراجی گرد و پیش میں کسی پسماندہ ملک میں مزدور ریاست۔

جدلیاتی سوچ کا بیہودگی سے وہی رشتہ ہے جو چلتی تصویر کا ساکت تصویر سے ہوتا ہے۔ چلتی تصویر ساکت تصویر کے خلاف نہیں جاتی بلکہ وہ حرکت کے اصول کے تحت ساکت تصویروں کو ایک تسلسل میں پرو دیتی ہے۔ جدلیات سچ سے انکار نہیں کرتی بلکہ بہت سے سچ اس طرح جوڑ دیتی ہے کہ ہم ازلی طور پر تغیر پذیر حقیقت کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہیگل اپنی کتاب ''منطق'' میں قوانین کا ایک سلسلہ قائم کرتا ہے۔ مثلاً مقدار کا معیار میں بدل جانا' تضادات کے ذریعے آگے بڑھنا' ہیت اور مواد کا تصادم' تسلسل میں مداخلت' امکان کا ناگزیریت میں تبدیل ہو جانا وغیرہ۔ نظریاتی سوچ کیلئے یہ سب کچھ اتنا ہی ضروری ہے جتنے قضیے ابتدائی کاموں کے لئے۔

ہیگل نے ڈارون اور مارکس سے پہلے لکھا تھا۔ انقلاب فرانس نے سوچ کو جو زبردست تحریک دی تھی اسکی بدولت ہیگل نے سائنس کی ترقی کو پیشگی دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک بڑے آدمی کی پیش بینی تھی مگر ہیگل نے اسے خیال پرستانہ کردار دے دیا اس نے خیالی سایوں کو حتمی حقیقت قرار دے ڈالا۔ لیکن مارکس نے کہا کہ یہ خیالی سائے مادی اجسام کی حرکت کا عکس ہیں۔

ہم اپنے جدلیاتی مادہ پرست سے کہتے ہیں کہ اس کی جڑیں نہ تو آسمان میں ہیں اور نہ ہی ہماری ''آزادانہ مرضی'' کی گہرائیوں میں ہیں بلکہ معروضی حقیقت یعنی فطرت میں ہیں۔ شعور لاشعور سے جنم لیتا ہے' نفسیات جسمانی علم سے' نامیاتی دنیا غیر نامیاتی سے' نظام شمسی ستاروں کے جھرمٹ یا بادلوں سے۔ ترقی کے اس زینے کے ہر قدم پر مقداری تبدیلیاں معیاروں میں بدلتی رہیں۔ ہماری سوچ بشمول جدلیاتی سوچ تغیر پذیر مادے کے مختلف رنگ اور روپ ہیں۔ اس نظام کے اندر خدا' شیطان' غیر فانی روح' قوانین کی ابدی قدروں اور اخلاقیات کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جدلیاتی سوچ فطرت کی جدلیات سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا کردار مکمل طور پر مادی ہے۔

ڈارون ازم جو مختلف صنفوں کی مقدار سے معیار میں تبدیلی کی وضاحت کرتا ہے' نامیاتی مادے کی دنیا میں جدلیات کی بہت بڑی فتح تھی۔ دوسری بڑی دریافت کیمیاوی عناصر کے ایٹمی اوزان کا ٹیبل ہے۔ اس سے آگے کی دریافت ایک عنصر کا دوسرے عنصر میں تبدیل ہو جانا تھا۔

ان ہیئت کذائیوں کے ساتھ درجہ بندی کا سوال قریبی طور پر وابستہ ہے جو فطری اور سماجی سائنس میں برابر کی اہمیت رکھتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے سویڈش

ماہر نباتات نے چیزوں کی عدم تبدیلی کے متعلق جو بات کی تھی اس میں پودوں کی خارجی خاصیتوں کے مطابق تشریح اور درجہ بندی کی گئی تھی۔علم نباتات کا وہ طفلانہ زمانہ منطق کے طفلانہ زمانے سے مشابہ تھا۔کیونکہ ہماری سوچ اسی طرح ترقی کرتی ہے جیسے دوسری زندہ چیزیں۔عدم تبدیلی کا خیال اسی وقت فیصلہ کن انداز میں جڑ سے اکھاڑا جا سکتا ہے جب پودوں کے ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور یوں حقیقی سائنسی درجہ بندی کی بنیاد تیار کی جائے۔

مارکس جو ڈارون سے امتیازی طور پر ایک باشعور جدلیات پسند تھا' اس نے انسانی سماجوں کی ان کی پیداواری طاقتوں کی روشنی میں سائنسی درجہ بندی دریافت کی تھی۔اس نے ملکیت کے تعلقات کا ڈھانچہ بھی معلوم کیا جو معاشرے کی جراحی پر مشتمل تھا۔ریاست اور سماجوں کی بیہودہ درجہ بندی کی جگہ مارکسزم نے لے لی جو جدلیاتی مادیت کی درجہ بندی ہے۔مارکس کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد ہی مزدور ریاست کے نظریے اور اس کے زوال کے لمحے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں اور جیسا کہ فریب خوردہ جہالت اور بے خبری تصدیق کرے گی' اس میں کہیں بھی کوئی مابعد الطبعیاتی یا عالمانہ بات نہیں ہے۔ معاصر سائنسی سوچ میں جدلیاتی منطق حرکت کے قوانین کی ترجمانی کرتی ہے۔اس کے برعکس جدلیاتی مادیت کے خلاف جدوجہد ایک دور افتادہ ماضی' پیٹی بورژوازی کی قدامت پسندی' خودفریبی کے مارے ہوئے یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کا واویلا اور کسی بعد کی زندگی کی امید کرنے والوں کی ترجمانی کرتی ہے۔

سوال- طبقاتی جدوجہد کیا ہوتی ہے؟

جواب-'' سب کو پتہ ہے کہ کسی بھی سماج میں کچھ لوگوں کے مقاصد اور

کاوشیں دوسرے لوگوں کے مقاصد اور کاوشوں سے متصادم ہوتے ہیں اور یہ کہ سماجی زندگی تضادات سے بھری پڑی ہے اور یہ کہ تاریخ سماجوں کے درمیان' اور سماجوں کے اندر ایک جدوجہد کو ظاہر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں انقلاب اور ردانقلاب' جنگ اور امن' جمود اور تیز رفتاری ترقی یا زوال کے دور بھی یکے بعد دیگرے آ رہے ہوتے ہیں۔ مارکس ازم اس سلسلے میں طبقاتی جدوجہد کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ بظاہر جو انتشار اور بھول بھلیاں نظر آ رہی ہوتی ہیں ان پر لاگو ہونے والے قوانین کو دریافت کرتا ہے۔ کسی ایک یا متعدد سماجوں کے اراکین کی مجموعی کاوشوں کے مطالعے سے ہماری رہنمائی ان کاوشوں کے نتیجے کی سائنسی تعریف تک ہوسکتی ہے اور یہ متصادم کاوشیں ان طبقات کے طرز زندگی اور حیثیت میں فرق سے جنم لیتی ہیں جن میں ہر سماج تقسیم ہوتا ہے۔

مارکس نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں لکھا تھا کہ'' تاریخ میں جتنے بھی سماج گزرے ہیں ان کی تاریخ طبقاتی جدوجہد سے عبارت ہے۔ (بعد ازاں اینگلز نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ماسوائے قدیم اشتراکی سماج کے) آقا اور غلام' جاگیردار اور مزارع' سرمایہ دار اور محنت کش قصہ مختصر یہ کہ جابر اور محکوم مسلسل ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہے ہیں اور ایک ایسی جنگ میں مستقل طور پر مصروف رہے ہیں جو کبھی پوشیدہ ہوتی تھی اور کبھی کھلی اور اس جنگ کا نتیجہ ہر بار یا تو سماج کی مجموعی انقلابی تشکیل نو کی صورت میں برآمد ہوتا تھا یا متحارب طبقات کی باہمی تباہی کی شکل میں۔ جاگیرداری سماج کے کھنڈرات سے ابھرنے والا جدید بورژوا سماج بھی طبقاتی دشمنوں کو ختم نہیں کرسکا اس سے محض اتنا ہی ہوسکا کہ اس نے نئے طبقات کو جنم دیا ہے جبر کے نئے حالات پیدا کیے ہیں پرانی ہیئتوں کی جگہ

جدوجہد کی نئی ہیئتوں کو دی ہے۔ ہمارے عہد یعنی سرمایہ داری کے عہد کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اس نے طبقاتی دشمنیوں کو سادہ کر دیا ہے سوال بحیثیت مجموعی دو عظیم جارح گروہ میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے۔ دو عظیم طبقات کے بعد جو ایک دوسرے کے سامنے براہ راست صف آراء ہیں یعنی بورژوازی اور پرولتاریہ۔''

مارکس کے کمیونسٹ مینی فسٹو سے لیا گیا درج ذیل پیرا ظاہر کرتا ہے کہ مارکس نے جدید سماج میں ہر درمیانے طبقے کی حیثیت کے معروضی تجزیے کے حوالے سے کیا وضاحت کی تھی۔

'' آج سرمایہ دار طبقے کے سامنے جتنے بھی طبقات صف آراء ہیں ان میں پرولتاریہ ہی حقیقی معنوں میں انقلابی طبقہ ہے۔ باقی طبقات جدید صنعت کے مقابلے میں بوسیدہ ہو کر بالآخر غائب ہو جاتے ہیں۔ پرولتاریہ اس کی خصوصی اور ناگزیر پیداوار ہے۔ نچلا درمیانہ طبقہ' چھوٹی صنعت کا مالک' دوکاندار' دستکار اور کسان' سب کے سب بورژوازی کے خلاف اس لئے لڑتے ہیں کہ وہ خود کو درمیانے طبقے کی جزیات کی حیثیت سے بچا سکیں لہذا وہ انقلابی نہیں بلکہ قدامت پرست ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ رجعتی ہیں کیونکہ وہ تاریخ کا پہیہ الٹا گھمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ اتفاق سے انقلابی بھی ہیں تو محض اپنے پرولتاریہ میں تبدیل ہو جانے کے خوف سے لہذا وہ اپنے حال کے نہیں بلکہ مستقبل کے مفادات کا دفاع کرتے ہیں وہ اپنا نقطہ نظر ترک کر کے اس کی جگہ پرولتاریہ کا نقطہ نظر اپنا لیتے ہیں۔''

بہت سی تاریخ سے متعلق تحریروں میں مارکس نے مادی نقطہ نظر سے تاریخ نویسی کی انتہائی شاندار اور گہری مثالیں دی ہیں۔ ہر انفرادی طبقے اور بعض اوقات

کسی طبقے کے اندر موجود پرت یا گروہوں کی حیثیت کا تجزیہ کر کے واضح کیا ہے کہ کیوں اور کیسے ''ہر طبقاتی جدوجہد ایک سیاسی جدوجہد ہوتی ہے۔'' مذکورہ بالا اقتباس ایک نمونہ ہے کہ مارکس تاریخی ارتقاء کے نتیجے کا تعین کرنے کیلئے کس طرح ایک کے بعد دوسرے طبقے میں تبدیل ہونے کے دوران آنے والے عبوری مراحل، ماضی سے مستقبل کی طرف اس کے سفر اور پیچیدہ سماجی رشتوں کے جال کا تجزیہ کرتا تھا۔

مارکس کا معاشی نظریہ اس تھیوری کی انتہائی جامع، گہری اور تفصیلی تصدیق اور اس کا اطلاق ہے۔

سوال- مطالعے کے سلسلے میں ٹراٹسکی کا نقطہ نظر کیا تھا؟

(29 مئی 1923ء)

جواب- ڈیئر کامریڈز!

آپ لوگوں نے شکایت کی ہے کہ آپ اپنی دلچسپی کی دس فیصد کتابیں بھی نہیں پڑھ پائے اور پوچھا ہے کہ اس کیلئے مناسب نظام الاوقات کیسے ترتیب دیا جائے۔ یہ ایک بہت مشکل سوال ہے کیونکہ اس کا فیصلہ بالآخر ہر شخص نے اپنی مخصوص ضروریات اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خود کرنا ہوتا ہے۔ تاہم یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص کس حد تک موجودہ ادب کے سلسلے میں باخبر رہ سکتا ہے، خواہ وہ سائنسی ہو سیاسی ہو یا کوئی اور، اس کا دارومدار صرف وقت کی مناسب تقسیم پر ہی نہیں بلکہ اس فرد کی سابقہ تربیت پر بھی ہوتا ہے۔

جہاں تک ''پارٹی یوتھ'' کی طرف آپ کے خصوصی حوالے کا تعلق ہے تو میں صرف یہ مشورہ دوں گا کہ جلد بازی سے کام نہ لیں اور خود کو زیادہ نہ پھیلائیں، ایک موضوع کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف نہ بھاگیں اور کوئی دوسری کتاب اس وقت نہ

شروع کریں جب تک آپ پہلی کتاب کو پڑھ کر غور وفکر کرنے کے بعد اس پر مکمل عبور حاصل نہ کرلیں ۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں خود نوجوان تھا تو میں بھی محسوس کرتا تھا کہ میرے پاس کافی وقت نہیں ۔ یہاں تک کہ جب میں جیل میں تھا اس وقت بھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ دن بھر میں میں جو پڑھ پاتا ہوں وہ کافی نہیں ہے ۔ معاشی شعبے کی طرح نظریاتی شعبے میں بھی سب سے زیادہ مشکل اور وقت طلب مرحلہ ابتدائی سرمائے کا ارتکاز ہوتا ہے ۔ صرف علم کے بعض عناصر بالخصوص نظری مہارت (طریقہ کار) کے عناصر پر مکمل دسترس حاصل کرکے انہیں اپنی فکری سرگرمیوں کا لازمی جزو بنانے کے بعد ہی آپ نہ صرف اس شعبے کے ادب کو سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ شناسا ہیں بلکہ علم کے ان شعبوں کو بھی جو اس سے مختلف ہیں کیونکہ آخری تجزیے میں طریقہ کار ہمیشہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے ۔

بہتر ہے کہ ایک کتاب پڑھی جائے ۔ بہتر ہے کہ ایک وقت میں چھوٹی سی بات پر عبور حاصل کیا جائے لیکن مکمل طور پر کیا جائے ۔ صرف اسی طرح سے سمجھ بوجھ کی دماغی صلاحیتیں خود کو فطری انداز میں فروغ دے سکتی ہیں ۔ فکر بتدریج خود اعتمادی حاصل کرے گی اور پھلے پھولے گی ۔ ان ابتدائی باتوں کو ذہن میں رکھ کر آپ باآسانی اپنے لئے ایک نظام الاوقات وضع کرسکیں گے ۔ اور پھر ایک سے دوسری دلچسپی کی طرف عبور آپ کو ایک خاص قسم کا لطف دے گا ۔

سوال - انقلاب مسلسل کیا ہے؟

جواب - نظریہ مسلسل انقلاب کی عملی بنیادیں تین کلیدی نکات پر مبنی ہیں ۔

پسماندگی اور جدیدیت کے ادغام پر مبنی معاشروں کے حکمران اپنی تاریخی اور اقتصادی کمزوری کی وجہ سے ان معاشروں کو ترقی یافتہ اور جدید بنانے کی اہلیت

نہیں رکھتے ۔تاریخی طور پر سرمایہ دارانہ صنعتی انقلاب کے جو فرائض بورژوا طبقے نے مکمل کرنے تھے ان میں جدید قوم اور قومی ریاست کی تشکیل، جدید صنعتی معاشرے کے قیام کے لئے درکار بنیادی ڈھانچے (انفراسٹرکچر) کی تعمیر، جاگیرداری کا خاتمہ اور زرعی انقلاب، پارلیمانی جمہوریت کی استواری اور مذہب کو ریاست سے الگ کیے جانا تھے ۔پاکستان اور دوسرے نوآبادیاتی ممالک کے حکمران 'آزادی' کے بعد ان میں سے کسی فریضے کی تکمیل نہیں کر سکے ۔اور بڑھتے ہوئے سامراجی تسلط میں اس نظام میں رہتے ہوئے کبھی بھی نہیں کر سکتے ۔ اس لئے ان فرائض کو تکمیل کیلئے درکار وسائل (بھاری صنعت، بینک، سرمایہ وغیرہ) کو ریاستی تحویل میں لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح قومی جمہوری انقلاب کے فرائض کو مکمل کرنے کیلئے سوشلسٹ اقدامات کرنے پڑتے ہیں ۔اس لئے اس انقلاب کا کردار مسلسل یا پیہم ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں جس طبقے نے انقلاب کی قیادت کرنی ہے وہ تاریخی اعتبار سے انسانی سماج کا جدید ترین طبقہ یعنی صنعتی مزدور یا پرولتاریہ ہے اپنی قیادت میں وہ غریب کسانوں اور سماج کے دوسرے پچھڑے ہوئے طبقات اور پرتوں کو لے کر ہی سرمایہ داری کا سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے خاتمہ کرے گا اس انقلابی سرکشی میں مسلح ایک سوشلسٹ انقلاب کے برپا ہونے سے کسی معاشرے میں سوشلزم نہیں آ جاتا ۔سوشلزم کا حتمی مقصد ایک طبقات سے پاک معاشرہ کا قیام ہے ایسا سماج جہاں تمام اشیائے صرف کی بہتات کے ساتھ مساوی اور اجتماعی فراہمی ہو ایک ملک اور خصوصاً ایک پسماندہ ملک میں موجود ثقافتی، صنعتی و فنی معیار اس قابل نہیں ہوتا کہ ان سے سوشلزم کے بنیادی تقاضوں کا حصول ممکن ہو اس لئے اگر سوشلسٹ انقلاب ایک ملک میں برپا ہوتا ہے تو سوشلزم کے حصول کیلئے پہلے تمام

خطے میں اور پھر عالمی طور پر سوشلسٹ انقلابات کے عمل کا پھیل جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

سوال- کیا سوویت یونین کے انہدام سے سوشلزم کی ناکامی ثابت نہیں ہوتی ہے؟

جواب- آج سے 88 سال قبل (پرانے روسی کیلنڈر کے مطابق 26 اکتوبر اور جدید کیلنڈر کے مطابق 7 نومبر کو) جو انقلاب برپا ہوا تھا اس کے ذریعے تاریخ میں پہلی مرتبہ محنت کش طبقے کی اکثریت نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں براہ راست اقتدار پر قبضہ کر کے ایک محنت کش ریاست کو جنم دیا تھا۔ اس انقلاب کی تیاری اور اس کو برپا کرنے میں بالشویک (B) (RSDLP) پارٹی نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ محنت کش طبقے کی ایک بھاری اکثریت نے سوویٹوں (پنچائتوں) کے ایک نظام میں منظم ہو کر اجتماعی طور پر اس انقلاب کو جنم دیا اور اقتدار پر قبضہ کیا۔ تقریباً 5 یا 6 سال تک یہ انقلاب ان کلاسیکی بنیادوں پر قائم رہا جو اس کے بانیوں نے رکھیں تھیں۔ لیکن 24-1923ء کے بعد اس کی زوال پذیری کا آغاز ہوا۔ سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کی پیش گوئی بھی سب سے پہلے اس انقلاب کے قائدین لینن اور ٹراٹسکی نے کر دی تھی۔ لیکن آج سامراجی پراپیگنڈہ کی یلغار میں جن دو حقائق کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1- اس انقلاب کی بدولت (زوال پذیری کے باوجود) 50 سے 60 سال کے قلیل عرصے میں روس ایک پسماندہ نوآبادیاتی ملک سے بدل کر دنیا کی دوسری بڑی معیشت کیسے بن گیا تھا۔

2- سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد روس اور دوسری سٹالنسٹ ریاستوں

میں بحران اور انسانی سماج کی جو کیفیت ہے وہ پہلے سے بہتر ہے یا بدتر ہے۔

1917ء میں زار شاہی کے جبر میں ایک غریب پسماندہ روس میں اکتوبر انقلاب نے جو بنیادی تبدیلی برپا کی تھی وہ منڈی پر مبنی معیشت (جہاں پیداوار کا مقصد سرمایہ دار کا حصول شرح منافع ہوتا ہے) سے تبدیل کر کے اس کو منصوبہ بند (سوشلسٹ) معیشت (جہاں پیداوار کا مقصد انسانی ضروریات کی تکمیل ہوتا ہے) میں تبدیل کر دیا تھا۔ مقصد پیداوار کی اس بنیادی تبدیلی نے سابقہ سوویت یونین میں ترقی کی جس رفتار اور وسعت کو جنم دیا اس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے خطے میں نہیں ملتی۔ 1990ء تک سوویت یونین اسٹیل، مشین ٹولز، ٹریکٹر، ٹرکوں، سیمنٹ، کوئلہ، گیس، تیل، ریلوے، بجلی سمیت 30 اہم اور بنیادی صنعتوں میں دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار کر رہا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد 25 سالوں میں مغربی ممالک کی نسبت روس نے 1975ء تک دوگنا ترقی کی۔ اس دور میں فی کس آمدن میں 160 فیصد اضافہ ہوا۔ سماجی خرچ کی مد میں 400 فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا۔ 5 کروڑ 60 لاکھ فلیٹ تعمیر کیے گئے۔ بنیادی اور ثانوی تعلیم پوری آبادی پر لازم تھی۔ شرح خواندگی 99 فیصد تک پہنچ گئی۔ دنیا میں سب سے زیادہ ڈاکٹر، انجینئر، ٹیکنیشن، سائنس دان اور ماہرین روس میں پیدا ہوئے۔ کئی شعبوں مثلاً خلائی تکنیک میں سوویت یونین نے امریکہ کو پچھاڑ دیا تھا۔ مکانوں اور ذرائع آمدورفت کے کرائے دنیا میں سب سے کم تھے۔ غذائی اشیاء کی قیمتیں اتنی کم تھیں کہ تمام اخراجات کر کے تنخواہ کا 50 فیصد سے زائد حصہ روسی محنت کش کے پاس بچ جاتا تھا۔ تعلیم علاج اور دوسری بہتر اجتماعی سہولیات مفت تھیں۔ چند سالوں میں سالانہ ترقی اور شرح پیداوار میں اضافہ 28 سے 30 فیصد رہا۔ کسی ملک کی سرمایہ دارانہ معیشت

اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکی تھی ۔سوویت یونین کے ٹوٹنے تک بیروزگاری ایک جرم تھا روزگار اور بنیادی سہولیات کی فراہمی کی ذمہ داری ریاست کے پاس تھی۔ مندرجہ بالا اعداد وشمار اور تاریخی حقائق ساری دنیا نے حالیہ تاریخ میں دیکھے ہیں۔ یہ سب کچھ ذرائع پیداوار کے ملکیت کے رشتوں کی تبدیلی' زمین اور بھاری صنعت معیشت اور تقسیم کے ڈھانچے قومیائے جانے' ذرائع مواصلات' معاشی تبادلے او ربیرونی تجارت پر مکمل ریاستی اجارہ داری کی بنیاد پر ہی ممکن ہوسکا۔انسانی تاریخ نے اتنی تیز ترین ترقی کسی اور دور یا نظام میں نہیں دیکھی۔

آج تمام تر پراپیگنڈے میں ان حقائق سے عوام کو بری طرح بے خبر رکھا جارہا ہے۔لیکن دوسری جانب جو اس ترقی کے صرف ایک رخ سے متاثر ہوکر روسی اور چینی افسر شاہی کے پیروکار بن گئے تھے وہ اتنی دیوہیکل ترقی کے باوجود سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ اور وہاں پر مروجہ نظام کی تباہی کے اسباب بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

سوویت یونین میں برپا ہونے والے بالشویک انقلاب کی زوال پذیری 1924ء کے بعد سے شروع ہوئی ۔اسکی بنیادیں انقلاب کے ساتھ ساتھ ہی جنم لینا شروع ہوئی تھیں ۔روس چونکہ 1917ء میں پہلے سے ہی صنعتی معاشی سماجی اور ثقافتی طور پر ایک پسماندہ ملک تھا اس لیے پہلی عالمی جنگ کی تباہ کاریوں نے وہاں کی بدحالی میں مزید شدت پیدا کردی۔ جنگ کے دوران اور اسکے فوری بعد انقلابی جدوجہد اور فتح کے خوف سے روس پر 21 ممالک نے فوجی چڑھائی کردی۔ چونکہ روس میں بالشویک انقلاب کی بدولت سامراجی ممالک میں اسی قسم کے انقلاب کا خطرہ بڑھ گیا تھا اس لیے انہوں نے اس انقلاب کو آغاز میں ہی ختم کرنے کا فیصلہ

کرلیا تھا۔لیکن اس انقلاب کی قیادت کے پاس وہ نظریاتی اور تنظیمی صلاحیتیں موجود تھیں جن کی بدولت انہوں نے اس سامراجی جارحیت کو شکست دی تھی۔ اسکے دو بنیادی طریقے اپنائے گئے۔

1 -تقریباً ساڑھے تین لاکھ کی بدحال فوج کو انقلابی عمل کے ذریعے صرف 18 ماہ کی قلیل مدت میں دفاع اور جنگ کے کمیسار (وزیر) ٹراٹسکی نے 30 لاکھ کی مضبوط سرخ فوج میں تبدیل کردیا۔جس نے سامراجی یلغار کے خلاف مزاحمت کے ذریعے بہت سارے معرکوں میں سامراجی فوجوں اور انکے گماشتوں کو شکست دی اور انقلاب کے دفاع میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

2 - دوسرا طریقہ کار محنت کشوں کی بین الاقوامی یک جہتی کا طریقہ کار تھا۔ چونکہ روس میں جنم لینے والا انقلاب کسی قوم یا ملک کا انقلاب نہیں تھا اور محنت کشوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم (دوسری انٹرنیشنل کی بائیں بازو کی حزب اختلاف) کی قیادت میں طبقاتی بنیادوں پر برپا ہوا تھا اس لیے اسی عالمی تنظیم کے پلیٹ فارم سے لینن اور ٹراٹسکی نے دنیا بھر کے محنت کشوں سے اپیل کی کہ اپنے طبقے کے اس انقلاب کے دفاع کیلئے عالمی طور پر جدوجہد کی جائے۔اس اپیل کے جواب میں نہ صرف امریکہ' برطانیہ فرانس اور دوسرے سامراجی ممالک کے محنت کشوں نے ہڑتالوں کے ذریعے حملہ آور فوجوں کی سپلائی بند کردی تھی بلکہ اس بالشویک تحریک کے نتیجے میں حملہ آور فوجوں کے بہت سے سپاہیوں نے جارحیت سے انکار کرتے ہوئے بغاوتیں کردی تھیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بالشویکوں نے جس نظریئے کے تحت انقلاب برپا کیا تھا وہ کسی ایک ملک میں سوشلزم نہیں بلکہ عالمی انقلاب کی لڑی کی ایک کڑی کے طور پر تھا۔

جولائی 1918ء میں لینن نے امریکی مزدوروں کے نام ایک خط میں لکھا ''ہم اس وقت ایک محصور قلعے میں ہیں (اور اس وقت تک رہیں گے) جب تک بین الاقوامی سوشلسٹ انقلاب کی قوتیں ہماری مدد کو نہ آئیں۔''

اسی سال نومبر میں لینن نے لکھا۔

''دنیا کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ ہم نے روسی انقلاب کو برپا کرنے میں کوئی مہم جوئی نہیں کی۔ بلکہ یہ ایک اہم ضرورت تھی کیونکہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ دنیا بھر میں سوشلسٹ انقلاب فتح یاب نہیں ہوتا تو برطانوی فرانسیسی اور امریکی سامراج روس میں پرولتاری انقلاب اور آزادی کا گلا گھونٹ دیں گے۔ ہم نے اپنا سب کچھ بین الاقوامی انقلاب کے سہارے داؤ پر لگا دیا ہے۔ ہم مکمل فتح تک صرف دوسرے ممالک کے محنت کشوں کے ساتھ مل کر ہی پہنچ سکتے ہیں۔''

اس فوجی اور بین الاقوامی محنت کش طبقے کی امداد اور یکجہتی سے روس میں انقلاب تو ہوگیا تھا لیکن کئی دوسرے خصوصاً ترقی یافتہ یورپی ممالک جن میں جرمنی، اٹلی، فرانس، ہنگری اور برطانیہ شامل ہیں کے انقلابات کے فتح یاب نہ ہونے کی صورت میں روس میں محنت کش طبقے کا انقلاب علیحدگی اور بیگانگی کا شکار ہونا شروع ہوگیا۔ جرمنی میں اسی عرصے میں تین انقلابات برپا ہوئے۔ ان میں نومبر 1918ء جنوری 1919ء مارچ 1921ء اور اکتوبر 1923ء کی انقلابی کوششیں اور سرکشیاں شامل تھیں۔ 1922ء میں لینن نے تیسری انٹرنیشنل کی مرکزی مجلس عاملہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''برلن جرمنی کا دل ہے اور جرمنی یورپ کا دل ہے۔ اگر جرمن انقلاب کامیاب نہیں ہوتا تو ہمارے انقلاب کا تباہی سے دوچار ہونا ناگزیر ہے۔ جرمن

انقلاب کی فتح کیلئے ہمیں اگر روسی انقلاب قربان بھی کرنا پڑا تو ہم ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔''

بعد میں جنم لینے والی زوال پذیری نے لینن کے اس تجزیئے کو پوری طرح سچ ثابت کیا۔ بالشویک انقلاب بچ تو گیا لیکن خانہ جنگی' سامراجی جارحیت اور یورپی انقلاب کی ناکامی کی بدولت روس میں انقلاب کے تنہا رہ جانے سے زوال پذیری کے عمل پر فیصلہ کن اثرات مرتب ہوئے۔

پسماندہ روس میں ان آفات نے قلت اور قحط کی صورتحال پیدا کردی۔ بالشویک پارٹی کے سینکڑوں لیڈر محنت کش ریاست کا دفاع کرتے ہوئے سول جنگ میں مارے گئے۔ جن کی جگہ اقتدار کی ہوس رکھنے والے بہت سے مفاد پرست چور دروازے سے بالشویک پارٹی میں گھسنا شروع ہوگئے۔ قلت اور مانگ میں اضافے نے جو بدحالی پیدا کی اس سے سماجی خلفشار انقلاب کے بعد بڑھنا شروع ہوگیا۔ اس کو روکنے کیلئے ریاستی اقدامات میں شدت آنا شروع ہوگئی۔ کیونکہ مانگ اور قلت ناگزیر طور پر ریاستی عناصر کو مضبوط کرتی ہے اور افسر شاہانہ (بیوروکریٹک) اقدامات کا جواز فراہم کرتی ہے۔ 1920ء تک صورتحال یہ تھی کہ قبل از جنگ (1913ء میں پہلی عالمی جنگ سے پیشتر) کی نسبت محنت کش طبقے کی تعداد صرف 43 فیصد رہ گئی تھی اس طرح پیداوار میں انقلاب کے بعد کی صورت حال میں پہلے کئی سال بڑھنے کی بجائے گرتی چلی گئی تھی۔ صنعتی پیداوار صرف 18 فیصد رہ گئی تھی۔ اسی طرح انقلاب کرنے والے محنت کش طبقے کے ہراول دستے کا بھاری حصہ انقلاب کے دفاع کی نذر ہوگیا۔ خانہ جنگی اور انقلاب کے خطرے کے پیش نظر بالشویکوں کو بعض اوقات بہت شدید اقدامات بھی کرنے پڑتے تھے۔ داخلی

انتشار اور بیرونی جارحیت کے خلاف لینن اور ٹراٹسکی کو 1920ء میں وار کمیونزم (جنگی کمیونزم) کی پالیسی کو بھی لاگو کرنا پڑا۔ ان مشکلات میں ایسے اقدامات کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔

ٹراٹسکی افسر شاہی کے ظہور کی ایک عام مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے: ''جب کسی بھی چیز کی قلت پیدا ہوتی ہے تو اس کے حصول کے لیے قطاریں لگ جاتی ہیں۔ جتنی زیادہ بدحالی ہوگی ان قطاروں میں اتنا ہی خلفشار ہوگا اس لیے ان کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک سپاہی کی ضرورت جنم لیتی ہے اگر گوشت کے حصول کیلئے ایسی قطاریں لگتی ہیں تو ان کو کنٹرول کرنے والا سپاہی اپنے لیے اچھا گوشت پہلے کٹوا کر رکھ لے گا۔ یہ عمل افسر شاہی کے جنم کی بنیاد بنتا ہے''۔

لیکن افسر شاہی کے جنم لینے کے عمل میں روس کی ثقافتی اور سماجی پسماندگی نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں انقلابات نہ ہونے سے روس کو نہ صرف صنعتی و معاشی تنہائی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ قومی اور ثقافتی بیگانگی کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔

اسی عمل سے افسر شاہی کے جنم کا آغاز ہوا تھا۔ عظیم مارکسی استاد فریڈرک اینگلز نے انیسویں صدی میں لکھا تھا: '' کسی بھی سماج میں جہاں فن سائنس اور حکومت ایک اقلیت کی ملکیت ہوتے ہیں وہاں وہ اقلیت ان کو اپنے مفادات کے حصول کیلئے غلط استعمال کرے گی اور اپنی اس پوزیشن سے بد دیانتی کرے گی جو کسی بھی حوالے سے اس کو ملی ہو۔ روس کی اس بڑھتی ہوئی افسر شاہی کی روش کو لینن نے اپنی کتاب '' بہتر کم مگر بہتر'' (Better Fewer But Better) میں اس طرح بیان کیا۔

''ہمارا ریاستی ڈھانچہ بوسیدگی کی حد تک قابل مذمت ہو چکا ہے۔ہمیں اس میں پیدا ہونے والی خامیوں کو دور کرنے کیلئے سنجیدہ اقدامات کرنے ہوں گے۔ان بیماریوں کی جڑیں ماضی سے نکل رہی ہیں۔ وہ ماضی جس کو ہم اکھاڑ کر پھینک تو چکے ہیں لیکن اس پر قابو نہیں پا سکے ہیں۔''

اس حوالے سے افسر شاہانہ زوال پذیری کا عمل معروضی طور پر تو چل رہا تھا لیکن 1923ء کے بعد اس کو داخلی اور نامیاتی شکل ملنا شروع ہوئی۔ 1922ء میں سٹالن جنرل سیکرٹری بنا (اس سے پیشتر جنرل سیکرٹری کے عہدہ کا مطلب پارٹی کی سرگرمیوں کو مربوط کرنے والا ہوتا تھا۔(جب بالشویک پارٹی نے انقلاب کیا تھا تو اس کا جنرل سیکرٹری سویڈلوف (Sverdlov) تھا۔اس طرح اس عہدے میں بیوروکریٹک اور جبر کی روش اجتماعی قیادت کے اصول کی بنیاد پر نہیں تھی اور ریاستی اقتدار میں بڑھتی ہوئی بدعنوان قیادت جو زیادہ تر چور دروازے سے داخل ہو رہی تھی اس نے سٹالن کی قیادت میں اس بیوروکریٹک زوال پذیری کو شعوری شکل دینی شروع کر دی۔ چند ایسی شخصیات جو انقلاب سے پیشتر بالشویک پارٹی کی دشمن تھیں اقتدار ملتے ہی چور دروازے سے گھس کر سٹالن کے اس عمل کے جاری کرتے ہی اس کی اہم مشیر بن گئیں۔ان میں مارٹی نوف (Marty Nov) یاروسلاوسکی (Yaro Slavasky) وائی شنسکی (Vyshinsky) شامل تھے۔ ان ''دانشوروں'' نے جو عارضی اقدامات مخصوص جنگ اور خلفشار کے عالم میں کئے گئے تھے ان کو مستقل شکل دے کر افسر شاہی کی بنیادیں استوار کرنا شروع کر دیں۔جوں جوں انکی اقتدار پر گرفت مضبوط ہونا شروع ہوئی انہوں نے پھر اس افسر شاہانہ زوال پذیری کو نظریاتی بنیادیں فراہم کرنا شروع کر دیں۔ان میں 26-1924ء

کے دور میں ایسے نظریات کو پروان چڑھایا گیا جو مارکسزم کی روح اور اساس کے منافی تھے۔ ان میں پہلا نظریہ انقلاب کے روس کی سرحدوں میں مقید ہو جانے اور دوسرے ملکوں میں نہ پھیل سکنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ یہ نظریہ جو لینن کی جنوری 1924ء میں وفات کے بعد ''ایک ملک میں سوشلزم'' کا نظریہ تھا۔ یہ نظریہ قومی تنگ نظری اور عالمی محنت کش طبقے کی بین الاقوامی تنظیم (تیسری انٹرنیشنل) پر روسی تنظیم کے ریاستی اقتدار کے بلبوتے پر حاوی ہونے اور بین الاقوامی محنت کشوں کے ڈسپلن اور کنٹرول سے باہر نکلنے کے لئے مرتب کیا گیا۔ کیونکہ اس نظریئے کے پوری طرح مسلط ہونے کے بغیر افسر شاہی پوری ''آزادی'' سے بدعنوانی اور جبر جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔

اس نظریئے کے تحت مارکسزم پر طبقاتی بین الاقوامیت کے برعکس ایک ملک میں سوشلزم کے نظریئے کی بدولت قومی تنگ نظری اور قوم پرستی کے جذبات اور نظریات حاوی ہونا شروع ہو گئے۔ لینن اور بالشویکوں نے جب انقلاب برپا کیا تھا تو وہ کسی ملک کے انقلاب سے زیادہ ایک طبقے کا انقلاب تھا جس کو عالمی سوشلسٹ انقلاب کے تسلسل اور عمل کا ایک حصہ سمجھا گیا تھا۔ مارکسزم نے قوم پرستی کی نفی کرتے ہوئے انسانیت کی نجات کو طبقاتی یکجہتی اور جدوجہد سے تعبیر کیا تھا۔ اسی بنیاد کو آگے بڑھاتے ہوئے لینن اور بالشویکوں نے انقلاب کے ذریعے جس ریاست کو جنم دیا تھا اس کا نام (USSR) سوویت سوشلسٹ ریپبلکوں کی یونین رکھا گیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انقلابی عمل کے پھیلاؤ سے پوری دنیا کا نام (USSR) ہو جائے گا۔ انقلاب برپا کرنے والی قیادت نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ سٹالن اور اسکے بعد آنے والے بیوروکریٹ اس عبوری سوشلسٹ سماج کو

ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی کے تحت اس کو ایک علیحدہ اور مستقل شکل دے دیں گے۔ دوسرے الفاظ میں سٹالنزم کا مارکسزم سے سب سے بڑا نظریاتی انحراف ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی تھا۔ سوویت یونین کے دفاع میں بالشویکوں نے بے پناہ قربانیاں دی تھیں اور اس کو سامراجی یلغار سے جس پالیسی (عالمی طبقاتی جدوجہد) کے ذریعے بچایا تھا اس کا مقصد روس کے انقلاب کو مقید کرنا نہیں تھا اسی میں ہی روسی انقلاب کی بقاء اور نجات ممکن تھی۔ مارچ 1918ء میں لینن نے لکھا ''عالمی سامراج ایک فتح یاب بڑھتے ہوئے سماجی انقلاب کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ ہماری پسماندگی نے ہی ہمیں آگے دھکیل دیا ہے اگر دوسرے ممالک کے انقلابی سرکشی کرنے والے محنت کشوں کی عظیم حمایت نہ ملی تو ہم ناگزیر طور پر مٹ جائیں گے۔

(لینن تصانیف جلد Xv صفحہ نمبر 187)

مارچ 1919ء میں لینن نے اس سوچ کو پھر دہرایا'' ہم محض کسی ایک ریاست کی بجائے ریاستوں کے ایک مشترکہ نظام میں رہ رہے ہیں۔ سوویت ریپبلک کے وجود کا سامراجی ریاستوں کے ساتھ ساتھ لمبے عرصے تک رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا' آخر میں ایک کو دوسرے پر فتح مند ہونا پڑے گا''۔ (لینن۔ تصانیف جلد Xvl صفحہ نمبر 149) 5 جولائی 1921ء کو پارٹی کانگریس کے اجلاس میں لینن بہت واضح تھا۔'' ہمارے لیے یہ واضح تھا کہ عالمی انقلاب کی مدد کے بغیر پرولتاریہ انقلاب کی فتح ناممکن ہے۔ انقلاب دوسرے پسماندہ ممالک میں اور کچھ زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں فوری طور پر یا جلد برپا ہوگا ورنہ ہم مٹ جائیں گے۔ اس نظریئے اور سوچ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے سوویت نظام کو ہر حالت اور تمام

قیمت ادا کر کے قائم رکھنے کی کوشش کی کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہم صرف اپنے لئے کام نہیں کر رہے بلکہ ایک بین الاقوامی انقلاب کے لئے کام کر رہے ہیں۔''

(لینن تصانیف جلد XvIII صفحہ نمبر 321)

اگر لینن کے ان نظریات کا موازنہ سٹالنسٹ افسر شاہی کے پروگرام' نظریات اور لائحہ عمل سے کیا جائے تو ہمیں احساس ہوگا کہ وہ لینن کے تمام تر بت بنانے اور قصیدے گانے کے باوجود اس کے نظریات اور سوچ کے الٹ چل رہے تھے۔ ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی کے تحت ان کو مارکسزم کی بیشتر پالیسیوں سے انحراف کرنا پڑا مثلاً انہوں نے اس پالیسی کے تحت سامراج اور سوشلسٹ معیشت پر مبنی ملک کے ساتھ ساتھ رہنے کے عمل کو مستقل شکل دے دی۔ قومی بنیادوں پر سوچنے والی افسر شاہی نے سامراج سے ملکی بنیادوں پر'' امن برائے بقاء باہمی'' کی پالیسی کو مستقل شکل دے کر مذاکرات اور سمجھوتے کرنے شروع کر دیئے۔ ان بنیادوں پر جہاں سامراج روس میں معاشی تبدیلی کو واپس کرنے میں ناکام رہا وہاں معمولی رعایتوں کے عوض اس نے روسی افسر شاہی سے ترقی یافتہ اور مغربی ممالک میں انقلابات کو جنم دینے کے عمل کو رکوانے کا کام لیا۔ اسی حوالے سے'' مرحلہ وار'' انقلاب کا نظریہ'' ایک ملک میں سوشلزم'' کے نظریئے کا تسلسل تھا۔ سامراجی ممالک کے ساتھ مذاکرات اور سمجھوتے کرنے میں سٹالنسٹ افسر شاہی نے جو'' رعایتیں'' دیں ان میں نوآبادیاتی ممالک میں انقلابات کو قومی جمہوری انقلاب یا عوامی جمہوری انقلاب کے مرحلے پر مقید کرنے کا مقصد ان ممالک میں سامراج کے استحصال کو قائم رکھنا تھا۔ اس پالیسی کے نتیجے میں چین (1925-27) چلی' ہندوستان اور دوسرے کئی ممالک میں انقلابات کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

داخلی محاذ پر لینن نے ایک عبوری سوشلسٹ سماج (جو سوشلزم کی طرف بین الاقوامی انقلاب کے ذریعے ہی بڑھ سکتا تھا) کیلئے مندرجہ ذیل معروضات تشکیل دی تھیں۔

☆عبوری ریاست کے ہر اہل کار کا عوام کی بنیادی پنچائتوں (سوویتوں) کے ذریعے منتخب ہونا۔ ان پنچائتوں کے سامنے جواب دہ ہونا اور سوویتوں کا کسی اہل کار کو واپس بلانے کا حق ہونا۔

☆ ہر اہل کار کا بتدریج تبدیل ہونا جس کی بنیاد محنت کشوں کے زیادہ سے زیادہ حصوں کا اقتدار میں شراکت اختیار کرنا (لینن کے الفاظ میں ہر باورچی وزیر اعظم اور ہر وزیر اعظم باورچی بن سکتا ہے)۔

☆ کسی علیحدہ فوج اور ریاست کا نہ ہونا بلکہ انقلاب کے دفاع کے لئے محنت کش عوام مسلح ہوں گے۔ دفاع کا زیادہ کام سپاہیوں کی سوویتوں کے ذمے ہونا۔

☆کسی بھی ریاستی اہل کار کی اجرت اور تنخواہ ایک عام ہنرمند مزدور سے زیادہ نہ ہونا۔

یہ بنیادیں انقلاب کے برپا ہونے کے چند سال بعد تک خونریزی خانہ جنگی اور بدترین حالات کے باوجود قائم رہیں۔ انسانی سماج کی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ اور حقیقی جمہوری ڈھانچہ اور طریقہ کار نہیں دیکھا گیا۔ آج کے سامراجی پراپیگنڈے میں لینن اور بالشویکوں کو جس بدترین آمریت کے نظام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ تاریخی حقائق نہ صرف اس کی نفی کرتے ہیں بلکہ آج کے مالیاتی سرمائے کی آمریت کی لونڈی جمہوریت کی جعل سازی کو بھی بے نقاب کرتے

ہیں۔

لیکن سٹالنزم کے تحت انقلاب کی زوال پذیری کے عمل نے محنت کشوں کی جمہوریت کے اس نظام کو بھی برباد کرنا شروع کر دیا۔ اس جمہوری بنیاد کے خاتمے نے سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ ٹراٹسکی کے مطابق'' ایک منصوبہ بند (سوشلسٹ معیشت) کی مسلسل تیز ترقی اور ارتقا کے عمل میں محنت کشوں کا مکمل جمہوری کنٹرول اور انتظام اسی طرح ضروری ہے جس طرح انسانی جسم کے لیے آکسیجن ضروری ہوتی ہے'' روس کا انقلاب ایک دن ایک سال میں زوال پذیر نہیں ہوا تھا بلکہ یہ 1923ء سے شروع ہو کر 1938ء تک کے عرصے پر محیط تھا۔ اس زوال پذیری کے خلاف سب سے پہلی آواز لینن نے اٹھائی تھی۔ لینن کی موت کے بعد اس جدوجہد کو ٹراٹسکی نے جاری رکھا۔

لیکن انسانی تاریخ بے پناہ المیوں کی داستان بھی ہے۔ یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ لینن اور ٹراٹسکی اور ان بالشویکوں کو عوامی حمایت کیوں نہیں مل سکی جو انقلاب کی زوال پذیری کے خلاف برسرپیکار تھے؟ دوسرے یہ کہ اگر سٹالن کی جگہ ٹراٹسکی سوویت یونین میں اقتدار پر قبضہ کر لیتا تو کیا پھر بھی زوال پذیری ناگزیر تھی یا نہیں؟

اکتوبر 1917ء کے انقلاب کے ذریعے جنم لینے والی تبدیلیوں کے ثمرات روس کے سماج کو 1923ء کے بعد ملنے شروع ہوئے۔ مثلاً 1913ء کے معیار پر سماجی اور صنعتی ترقی 1923ء میں جا کر پہنچی تھی۔ جبکہ 1917ء کے بعد پر انتشار حالات کی وجہ سے انقلاب کے فوری بعد کے دور میں معیار زندگی گرتا چلا گیا تھا۔ لیکن معیشت کو سنبھالا صرف اسی وقت ملا جب سیاسی زوال پذیری شروع ہو چکی تھی

اور افسر شاہی شروع ہو چکی تھی اور افسر شاہی مزدور جمہوریت کو ختم کر کے اپنا تسلط مضبوط تر کر رہی تھی لیکن یہی وہ وقت تھا کہ روس کے عوام الناس کا معیار زندگی ایک سیاسی انقلاب کے ذریعے تیزی سے بڑھنا شروع ہو گیا۔ جنگوں' انقلابات اور انقلابات کے طوفانوں اور انتشار سے نکلنے والے روسی محنت کشوں کے وسیع حصے بری طرح تھک چکے تھے۔ بڑھتے ہوئے معیار زندگی میں ان کو بڑے عرصے بعد آسائش نصیب ہوئی تھی وہ پھر ایک نئی لڑائی لڑنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ٹراٹسکی اور بائیں بازو کی حزب اختلاف کا ساتھ نہیں دیا جن کو انقلاب کی زوال پذیری کو بچانے کے لیے سٹالنسٹ افسر شاہی کے خلاف ایک نئی سیاسی اور سماجی جنگ کرنی پڑ رہی تھی۔ المیہ یہ تھا کہ جس اکتوبر انقلاب نے روس کے عوام کے معیار زندگی کو تیزی سے بڑھانا شروع کیا تھا اسی انقلاب نے لینن کے ساتھ قائد اور تخلیق کار ٹراٹسکی کی عوامی حمایت کو کمزور کرنے میں اسی بڑھتے ہوئے معیار زندگی نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

دوسری جانب یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر سٹالن کی جگہ ٹراٹسکی برسر اقتدار ہوتا تو انقلاب زوال پذیر نہ ہوتا لیکن تاریخ میں فرد کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ اگر لینن اور ٹراٹسکی نہ ہوتے تو شاید انقلاب برپا نہ ہوتا۔ لیکن سٹالن نے اس زوال پذیری کے معروضی عمل کو شعوری اور داخلی شکل دی۔ کم از کم ٹراٹسکی کی قیادت میں یہ نہیں ہونا تھا۔ لیکن پھر آخری تجزیے میں معروضی حالات فیصلہ کن اثر رکھتے ہیں۔ اس لیے تاریخ کے ان عوامل میں کوئی حتمی فیصلہ یا رائے نہیں دی جا سکتی' کیونکہ ایک سے کہیں زیادہ عناصر ایسے تھے جن کی بدولت انقلاب زوال پذیر ہوا۔

اس زوال پذیری کو مکمل کرنے کے لیے جہاں سٹالنسٹ افسر شاہی نے

شعوری یا لاشعوری طور پر بے پناہ سیاسی غلطیاں اور جرائم کیے۔ (جرمنی، فرانس، چین، برطانیہ وغیرہ) وہاں انہوں نے بالشویک لیننسٹ حزب مخالف کو بری طرح کچلنے کی بھی کوشش کی۔ اس جنگ میں 13 لاکھ کے قریب بالشویکوں اور انقلاب کی سیاسی زوال پذیری کے خلاف جدوجہد کرنے والے افراد اور انکے خاندانوں کا قتل عام ہوا۔ جس پارٹی (بالشویک پارٹی) کی قیادت میں اکتوبر کا انقلاب برپا ہوا تھا اس کی مرکزی کمیٹی کے 24 میں سے 23 ممبران 1938ء تک یا تو قتل کر دیئے گئے تھے یا خانہ جنگی میں شہید ہوئے تھے یا جیلوں اور سائبیریا کے کیمپوں میں پابند سلاسل تھے یا پھر جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ روس میں صرف ایک ممبر باقی رہ گیا تھا۔ وہ سٹالن بذات خود تھا۔

لیکن سٹالنزم اور افسر شاہی کی حکمرانی کو 5 سے 7 دھائیوں تک طول نصیب ہوا وہ بنیادی طور پر اکتوبر انقلاب کی معاشی تبدیلی کی مرہون منت تھا۔ سٹالنزم بنیادی طور پر اکتوبر انقلاب کے خلاف سیاسی ردانقلاب تھا۔ جبکہ معاشی بنیادیں وہی رہی تھیں جن کو سرمایہ داری، جاگیرداری اور سامراجی تسلط کا خاتمہ کر کے سوشلسٹ منصوبہ بندی پر استوار کیا تھا۔ اس معاشی نظام نے ان 65 سالوں میں سرمایہ داری کی منڈی کی معیشت کے نظام میں اپنی برتری تیل، سٹیل، سیمنٹ، عمارات، ٹریکٹروں، خلائی ٹیکنالوجی اور بے پناہ سماجی ترقی کی شکل میں ثابت کی۔ سٹالنسٹ افسر شاہی نے اس ترقی کے بلبوتے پر کئی نسلوں تک حکمرانی کی۔ لیکن مارکسزم لینن ازم سے انحراف اور غداری کی بدولت افسر شاہی نے سوشلزم کو نظریاتی اور عملی طور پر جس طرح مسخ کیا تھا اس بنیاد پر وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی تھی۔ ان بنیادوں پر سٹالنزم کا لمبے عرصے تک برقرار رہنا ناممکن تھا۔

جوں جوں منصوبہ بند معیشت صنعتی اور تیکنیکی ترقی تیز کرتی گئی اسی سے معیشت کی وسعت بھی بڑھتی گئی۔لیکن اس معیشت کی وسعت سے افسر شاہی کے حجم میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔مزدور جمہوریت اور کنٹرول و انتظام کے فقدان کی وجہ سے اس افسر شاہی کی آمریت نے اس معیشت پر بوجھ بننا شروع کر دیا۔1970ء کی دہائی میں روس کی صنعت اور معیشت 10 لاکھ سے زائد اشیاء بنا رہی تھی۔لیکن اسکی منصوبہ بندی 28 کروڑ آبادی کے ملک جو دنیا کی خشک سطح کے 1/6 حصے پر محیط تھا۔ صرف ماسکو میں قائم 50 وزارتیں کام کر رہی تھیں۔ جس سے بدانتظامی اور پیدا ہونے والی اشیاء کے معیار میں تیزی سے گراوٹ آ رہی تھی۔ دوسری طرف منڈی اور منافع کے لالچ سے پاک سماج میں پیداوار کی انتہا ہو رہی تھی لیکن بدانتظامی کی وجہ سے اس پیداوار کے بڑے حصوں کا ضیاع ہو رہا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ افسر شاہی نے اپنی عیاشیوں اور بدعنوانی کی انتہا کر دی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر جبر اور آمریت کے دور میں ناگزیر طور پر بدعنوانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح افسر شاہی کی بدعنوانیوں' بدانتظامی' ضیاع اور اس کے اپنے وجود کے بوجھ سے منصوبہ بندی پر مبنی معیشت کا دم گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ 1970ء کی دہائی تک آتے آتے افسر شاہی 2 کروڑ 50 لاکھ سے زیادہ افراد پر مشتمل ہو چکی تھی۔ مزدور جمہوریت کے فقدان نے آخر کار ایک سوشلسٹ معیشت کے ارتقاء کے عمل میں رکاوٹ بننا شروع کر دیا۔ لیکن ان داخلی پالیسیوں کا تسلسل افسر شاہی کی خارجہ پالیسیاں بھی تھیں۔امریکی سامراج اور روسی افسر شاہی کے درمیان تضادات اور سرد جنگ کی اصل وجہ دونوں حکمران ٹولوں کی متضاد معاشی بنیادیں تھیں۔ لیکن'' ایک ملک میں سوشلزم'' کے سٹالنسٹ نظریئے کے تحت سامراجی

ممالک میں انقلابی عمل کو تیز کرنے کی بجائے ایک طرف سامراج سے سمجھوتے ہوتے رہے جبکہ دوسری جانب بیرونی خطرے کے خلاف بے پناہ وسائل اسلحہ سازی اور دفاع پر خرچ ہوتا تھا۔ مجموعی قومی آمدن و پیداوار کا 60 فیصد بلواسطہ یا بلاواسطہ ان شعبوں پر خرچ ہوتا رہا۔ دوسری جانب اسی'' امن برائے بقائے باہمی'' کی پالیسی کی وجہ سے 1930ء کی دہائی اور بعد از جنگ سامراجی ممالک میں ابھرنے والے محنت کشوں کے انقلابات سٹالنسٹ اور سوشل ڈیموکریٹک روایتی قیادتوں کی غلط پالیسیوں کی بدولت ناکام ہوئے اور سرمایہ دارانہ نظام کو پھر زندہ کرنے کا موقعہ مل سکا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران 1943ء میں یالٹا میں ہونے والے معاہدے میں سٹالن چرچل اور روزویلٹ جو مغربی اور مشرقی یورپ کی بندر بانٹ کے اس معاہدے کے تحت فرانس، اٹلی اور یونان کے یقینی انقلاب جن کی قیادت ماسکو نواز کمیونسٹ (سٹالنسٹ) جماعتوں کے پاس تھی کو قربان کر دیا گیا۔ ان پالیسیوں کے نتیجے میں سامراج کو عالمی طور پر ایک نئے (تاریخ کے سب سے لمبے ابھار 1948-73) سرمایہ دارانہ عروج کا موقع مل گیا جس کو استعمال کرتے ہوئے خصوصاً امریکی سامراج نے اپنی پوزیشن عالمی اقتصادی اور سیاسی طور پر مستحکم کی۔ اس معاشی ابھار کے اثرات سے سوویت یونین پر بھی معاشی اور اقتصادی دباؤ بڑھنا شروع ہوگیا۔'' ایک ملک میں سوشلزم کی فرسودہ پالیسی کے تحت ابتدائی 3 دہائیوں میں سٹالنزم نے سوویت معیشت کو محدود کر کے رکھ دیا اور عالمی منڈی میں شراکت نہیں کی۔ صرف 1953ء میں سٹالن کی موت کے بعد معیشت کے اندرونی دباؤ کی بنیاد پر عالمی منڈی میں مداخلت کی گئی اور اس کو بھی بڑا محدود رکھا گیا۔ دوسری جانب سوویت یونین پر سامراج کا معاشی دباؤ بڑھ رہا تھا اور سامراجی

ممالک میں انقلابی تحریکوں کے ماند پڑنے سے حالات بدتر ہو رہے تھے جس کو سٹالنسٹ لیڈر سمجھنے سے قاصر رہے۔ٹراٹسکی نے سٹالنسٹ نظریہ دانوں کی اس سوچ کے بارے میں 1929ء میں لکھا تھا۔

''یہ (لیڈر) اس بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے تھے کہ ایک فورڈ ٹریکٹر اتنا ہی خطرناک ہے جتنی کروساٹ (Crevesot) کی توپ ہے۔ان میں واحد فرق یہ ہے کہ توپ کبھی کبھی استعمال ہوتی ہے جبکہ ٹریکٹر مسلسل دباؤ بڑھاتا رہتا ہے اس کے علاوہ ٹریکٹر یہ بھی جانتا ہے کہ آخری حربے کے طور پر توپ اسکے پیچھے رہتی ہے۔ (ٹراٹسکی 1929)

لینن نے بھی اس خطرے کی واضح نشاندہی کی تھی۔'' جب تک ہماری سوویت ریپبلک علیحدہ سرحدوں میں محدود رہتی ہے جس کو ساری سرمایہ دارانہ دنیا نے گھیرا ہوا ہے۔ اس وقت تک یہ ایک بے وقوفانہ خواب اور بے ہودہ تصوراتی یوٹوپیا ہوگا۔ جب ہم یہ سوچنا شروع کردیں کہ ہمیں مکمل معاشی آزادی حاصل ہوچکی ہے اور ہمارے خطرات ختم ہو چکے ہیں۔سرمایہ داری کو اگر اس کے عالمی پیمانے پر لیا جائے تو اب بھی نہ صرف فوجی بلکہ معاشی لحاظ سے وہ سوویت طاقت سے زیادہ طاقتور ہے۔ ہمیں اس بنیادی کیفیت کو مدنظر رکھ کر یہاں سے آگے بڑھنا ہوگا اور اس کو کبھی فراموش نہیں کرنا ہوگا۔

(لینن-تصانیف-جلد نمبر XVII صفحات 102 اور 409)

روس جو غربت کا دیس ہے وہ امارت اور فراوانی کا دیس صرف اسی صورت بن سکتا ہے جب ہم بدگمانی اور مصنوعی نعرہ بازی کو جھٹک دیں اپنے دانتوں کو دباتے ہوئے اپنی تمام قوتوں کو اکٹھا کرکے ہرنس ہر پٹھے اور ہر رگ کو تان کر یہ سمجھیں کہ ہم

نجات صرف اس بین الاقوامی سوشلسٹ انقلاب کی شاہراہ سے ہی حاصل کر سکتے ہیں جس پر ہم قدم رکھ چکے ہیں۔

(لینن-تصانیف-جلد XV صفحہ نمبر 165)

لیکن لینن کے برعکس روس میں سٹالنزم کی سوچ رکھنے والی افسر شاہی نے نہ صرف سامراج کے حوالے سے بلکہ دوسرے ممالک میں جنم لینے والے" سوشلسٹ" انقلابات کے حوالے سے بھی حامل محنت کش تحریک کو زبردست نقصان پہنچایا۔چین' کیوبا' ویتنام' کمبوڈیا' لاؤس' موزمبیق' انگولا اور دوسرے ممالک جہاں ریاستی بغاوتوں اور گوریلا جنگوں کے ذریعے انقلابات آئے اور سرمایہ داری و جاگیرداری کو اکھاڑ پھینکا ان کے سامنے عالمی سیاست پر سوشلزم کا حاوی ماڈل ماسکو کا تھا۔لیکن ان ادوار میں یہ ماڈل لینن کے ماسکو کے بجائے سٹالن' خروچیف' برزنیف اور ندروپوف کے ماسکو کا ماڈل تھا۔جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے بھی وہی نظریات اور لائحہ عمل اپنایا جو ماسکو میں اقتدار پر براجمان سٹالنسٹ افسر شاہی کا تھا۔اس طرح چین' سوویت یونین' کیوبا' ویتنام اور دوسرے سوشلسٹ ممالک کے الحاق سے جو ایک عظیم سوشلسٹ فیڈریشن بن سکتی تھی وہ "ایک ملک میں سوشلزم" کی پالیسی کے تحت قومی سوشلسٹ ریاستوں میں بٹ گئی۔کامریڈ آپس میں اسلحہ' بارود اور میزائلوں کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ چینی' روسی اور دوسری افسر شاہیاں" قومی مفادات" کے تحت تمام پالیسیاں مرتب کر رہی تھیں۔ان سے" سوشلسٹ" ممالک کے درمیان تضادات اور بعض اوقات جنگوں کی شکل میں تصادم ابھرے۔یہ سٹالنزم کی قومی سوشلزم کی پالیسی کا منفی نتیجہ تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر افسر شاہی کی بدعنوانیوں کے بوجھ'

مغرب کی نسبت ٹیکنیک میں پسماندگی' مزدور جمہوریت کے فقدان اور افسر شاہی کے جبر کی وجہ سے سوشلسٹ معیشت کی رفتار سست ہونا شروع ہوگئی تھی۔ 1950ء کی دہائی میں جب معیشت میں 12 سے 15 فیصد سالانہ کے اعتبار سے پیداوار میں اضافہ ہو رہا تھا وہ 1960ء کی دہائی میں کم ہو کر 10 فیصد سے 12 فیصد ہو گیا اور 1970ء کی دہائی میں کم ہو کر 6 سے 8 فیصد ہو گیا اور 1980ء میں گورباچوف کے مشیر برائے اقتصادیات ابیل ابی بگیان کے مطابق 0% فیصد سے بھی کم رہ گیا تھا۔ اس معاشی بحران نے افسر شاہی کے سیاسی اعتماد کو بھی سخت ٹھیس پہنچائی اور وہ تذبذب میں ڈوبنے لگی۔ گورباچوف جو افسر شاہی کا نسبتاً ذہین اور چالاک نمائندہ تھا۔ اس نے سٹالنزم میں اصلاحات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آمرانہ افسر شاہی کے جبر کے نیچے سلگتا ہوا معاشی سماجی اور قومی تضادات کا لاوا پرسٹریکا اور گلاسناسٹ کی پالیسیوں سے پھٹ پڑا۔ سٹالنزم کا بحران اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ اس میں اصلاحات کی گنجائش ختم ہو چکی تھی۔ جب گورباچوف کو اپنی پالیسیوں کی شکست نظر آئی تو اس نے سامراج کی گود میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے خلاف گیناڈی ژنائف کی قیادت میں پرانے سخت گیر سٹالنسٹوں کے ایک کمزور اور نحیف گروپ نے بغاوت کرنے کی کوشش کی جس کو سامراج کی پشت پناہی میں بورس یلسن نے ناکام کر دیا۔ لیکن سامراجی حمایت میں روس میں سرمایہ داری کی دوبارہ استواری کی تکمیل ابھی تک مکمل نہیں ہو سکی۔ 15 سال کی بے پناہ کوشش کے باوجود افسر شاہی کا سرمایہ دار مفاد پرست حصہ معیشت کو نجی ملکیت میں مکمل طور پر نہیں دے سکا۔ اس وقت بھی روس کی حاوی معیشت اور بھاری صنعت کا بیشتر حصہ آج بھی ریاستی ملکیت میں ہے۔ جس کو پرائیویٹائز کر کے سرمایہ دارانہ منافع حاصل کرنے کے

خواب چکنا چور ہو گئے ہیں۔ جس سے ایک طرف سٹالنزم ٹوٹا ہے جبکہ دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام شدید خلفشار کا شکار ہے اور اپنے قدم نہیں جما سکا۔ لیکن سابقہ سوویت یونین کی ریاستوں اور روس میں انسانی زندگی درندگی اور بربریت کی طرف جا رہی ہے۔ کسی بہتری کی بجائے تباہی اور بربادی کا دور دورہ ہے۔ 1997ء تک روس میں بیروزگاروں کی تعداد 5 کروڑ تک ہو گئی تھی۔ قیمتوں میں 700 سے 3600 فیصد اضافہ ہوا۔ مکانوں اور کرایوں میں اضافے کی بھی یہی صورتحال تھی۔ ماسکو میں جرائم کی رفتار اور تعداد میں 2000 فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ روبل کی قیمت 1992ء میں تقریباً ایک ڈالر کے عوض 2 روبل کی تھی۔ 1997ء میں ایک ڈالر کے عوض ہزاروں روبل تھی۔ اس معاشی اور سماجی بدحالی نے روس کے محنت کشوں کو شدید صدمے اور اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایک طرف انہوں نے کئی نسلوں تک ''سوشلزم'' اور ''کمیونزم'' کے نام پر 60 سال تک سٹالنزم کا کھلواڑ برداشت کیا۔ جس سے ان کو شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن سرمایہ داری کو استوار کرنے کے عمل نے تو ان کو تباہی و بربادی کی ایک بھیانک کھائی میں دھکیل دیا ہے۔ اسی وجہ سے روس میں خلفشار، سماجی بے چینی اور ہلچل اپنی انتہاؤں کو پہنچ گئی ہے۔ یہ اضطراب نہ صرف سماج کی نچلی سطحوں میں بحران کو بڑھا رہا ہے بلکہ ریاست اور افسر شاہی کے مختلف حصوں میں تضادات اور تصادم بڑھ گیا ہے۔ یہی صورتحال فوج میں بھی پائی جاتی ہے۔

سوویت یونین کا ٹوٹنا مارکسٹوں کیلئے کوئی حیران کن واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کی پیشین گوئی اس کے بانیوں نے ہی کی تھی۔

ٹراٹسکی نے 1920ء میں لکھا تھا ''ایک درست قیادت کے بغیر پرولتاریہ کی

آمریت (مزدور جمہوریت) کمزور پڑ جائے گی اس کا ٹوٹ کر گر جانا بین الاقوامی انقلاب پر ایک سخت ضرب لگائے گا جس سے صحت یاب ہونے اور نکلنے میں بہت سے سال لگ جائیں گے۔'' مارکس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''سرمایہ'' میں واضح کیا تھا کہ ذرائع پیداوار جب کسی ایک معاشی اور قومی ڈھانچے میں جنم لیتے ہیں تو ان کے ارتقاء کے عمل کے راستے میں جب قومی حدود یا کسی تنگ نظر نظام کی دیواریں حائل ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو ان ذرائع پیداوار کا ٹھہراؤ پھر اس سماج میں گھٹن اور خلفشار پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ سماج اور نظام تاریخی استبداد کا شکار ہو جاتا ہے اور اسکی ٹوٹ پھوٹ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ سوویت یونین میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اسی لیے سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ مارکسزم کی نفی نہیں کرتی بلکہ ایک منفی انداز میں اسکی سائنسی سچائی کو ثابت کرتی ہے۔ اسی بنیاد پر یہ بات ایک سائنسی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آج بھی اکتوبر کی سرزمین کی واحد راہ نجات ایک نیا اور جدید سوشلسٹ انقلاب ہی ہو سکتا ہے۔

سیاسی معاشیات کی تنقید پر دیباچہ

دیباچہ

میں بورژوا معیشت کے نظام کا اس ترتیب سے جائزہ لینا چاہتا ہوں: سرمایہ، زمین جائداد، مزدوری (اجرتی محنت)، ریاست، غیر ملکی تجارت اور عالمی منڈی۔ پہلے تین عنوانوں کے تحت ان تین بڑے طبقوں کی زندگی کے معاشی حالات کی چھان بین کروں گا جن میں آج کی بورژوا سوسائٹی بٹی ہوئی ہے۔ باقی تینوں عنوانوں کا باہمی تعلق تو ظاہر ہے۔ کتاب اول کا پہلا حصہ جس میں سرمائے سے بحث کی گئی ہے، تین بابوں پر تقسیم ہے:

(1) مال، (2) زر یا روپیہ یا صرف رقم کی گردش، (3) سرمایہ عام طور سے۔

پہلے دو باب میں موجودہ کتاب کا سارا بیان آجاتا ہے۔ تمام سروسامان میرے سامنے مونوگرافوں کی صورت میں پھیلا ہوا ہے جو مختلف اوقات میں بڑے بڑے وقفوں سے لکھے گئے تھے اور اشاعت کے خیال سے نہیں بلکہ صرف ذاتی وضاحت یا تشریح کی خاطر لکھے گئے تھے۔ اوپر دیے ہوئے نقشے کے مطابق ان مونوگرافوں کا آگے تک پھیلاؤ اس پر منحصر ہے کہ باہر کے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔

میں نے جو عمومی دیباچہ (2) کا خاکہ تیار کر رکھا تھا اسے چھوڑتا ہوں کیوں کہ جب گہرائی تک نظر ڈالی تو میں اس فیصلے پر پہنچا کہ ایسے نتیجوں کا پہلے سے قیاس کر لینا جو ابھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچے ہیں، الجھاؤ پیدا کرے گا، پس یہی مناسب ہے کہ پڑھنے والا جو میرے ساتھ آنا چاہے وہ خاص سے عام کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ البتہ کچھ یادداشتیں جو میں نے اپنے سیاسی معاشی مطالعے کے سلسلے میں

تیار کی تھیں، یہاں موقع کے مطابق بیان ہوتی رہیں گی۔

تعلیم میں میرا خاص مضمون تھا قانون، تاہم فلسفے اور تاریخ کے ساتھ ساتھ میں قانون کے مضامین کو ثانوی حیثیت سے سیکھتا رہا۔

1842-43 میں جب Rheinische Zeitung (3) کا ایڈیٹر تھا تو مجھ کو مشکل پیش آئی کہ پہلی بار ان اختلافی سوالوں پر زبان کھولنی پڑی جنہیں، مادی مفاد، کہتے ہیں۔ رائن صوبے کے لاندتاگ (قانون ساز اسمبلی) میں جنگل کی چوریوں اور زمین جائداد کی تقسیم پر جو بحث ہوئی، رائن صوبے کے اس وقت کے "اوبر پریسیڈنٹ" (چیرمین) فان شاپر کی موزیل کے کسانوں کی حالت پر جو سرکاری بحث Rheinische Zeitun اخبار کے ساتھ چلی اور ہوتے ہوتے آخر تجارت کی آزادی اور حفاظتی ڈیوٹی لگانے پر جو مباحثے چھڑ گئے، ان سب نے ٹھو کے دے کر مجھے معاشی اقتصادی سوالوں کا مطالعہ کرنے میں لگا دیا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ ان دنوں جب "قدم آگے بڑھانے" کی تمنا تو کہیں زیادہ تھی لیکن موضوع کی معلومات بہت کم، Rheinische Zeitung اخبار میں فرانسیسی سوشلزم اور کمیونزم کی گونج بھی سنائی دینے لگی، اگرچہ فلسفیانہ رنگ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ میں نے اس ادھ کچرے پن کے خلاف اظہار خیال کیا لیکن آگس برگ کے اخبار Allgemeine Zeitung (4) سے سوال جواب کرنے میں کھلے طور سے یہ مان لیا کہ فی الحال میری معلومات اتنی نہیں ہیں کہ فرانسیسی رجحانات کی حقیقت پر کوئی فیصلہ دینے کی ہمت کر سکوں۔ اور تو اور میں نے Rheinische Zeitung اخبار چلانے والوں کی اس خوش فہمی سے بروقت اور خوب کام نکالا کہ اگر اخبار نرم یا مصالحت آمیز رویہ اختیار کرلے تو اس کا پھانسی کا پھندا ڈھیلا ہو جائے

گا۔اور میں نے سماجی اکھاڑہ چھوڑ کر مطالعے والے کمرے کا رخ کیا۔

پہلی تصنیف جسے میں نے اپنی الجھنیں دور کرنے کے لئے سامنے رکھا وہ ہیگل کے فلسفہ حقوق کا تنقیدی مطالعہ (کارل مارکس "ہیگل کے فلسفہ حقوق کی تنقید پر") A Contribution to the Critique of Philosophy of Right تھی جس کا دیباچہ 1844 میں پیرس سے شائع ہونے والے اخبار (5) Deutsch Franzosische Jahrbucher میں شائع ہوا تھا۔ میری تحقیق و تلاش نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ ریاست کی مختلف شکلوں کی طرح حقوق یا قانون کی کڑیوں کو بھی، نہ تو بجائے خود سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کی مدد سے سلجھایا جا سکتا ہے جسے انسانی اسپرٹ کی عام اٹھان کہتے ہیں، بلکہ اس کے برخلاف باہمی حقوق کی جڑیں زندگی کے ان مادی تعلقات کے اندر اتری ہوئی ہیں جن کے مجموعے کو ہیگل فلسفی نے اٹھارویں صدی کے انگریز اور فرانسیسی ادیبوں کی دیکھا دیکھی "شہری سماج" کا نام دیا ہے اور اگر اس شہری سماج کے کل پرزے معلوم کرنے ہوں تو سیاسی معاشیات میں تلاش کرنے ہوں گے۔اس مضمون کا مطالعہ میں نے پیرس میں شروع کیا تھا اور جب وہاں سے مجھے مسٹر گیزو کے حکم سے جلاوطن کیا گیا تو میں برسلز میں بس گیا اور یہاں بھی یہ مطالعہ جاری رکھا۔ میں اپنی تلاش میں جس عام نتیجے تک پہنچا اور جو بعد میں میری تحقیق کے لئے نشان راہ بنتا چلا گیا وہ مختصر طریقے سے یوں پیش کیا جا سکتا ہے: لوگ جب مل کر زندگی میں کسی پیداواری عمل میں حصہ لیتے ہیں تو اس عمل میں لازمی طور سے وہ باہمی تعلقات بھی بنا لیتے ہیں جن میں ان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا البتہ پیداوار میں یہ تعلقات ان کی مادی پیداواری طاقتوں کے اس خاص مرحلے سے (جس پر وہ پہنچے ہوں) ضرور میل کھاتے

ہیں ۔ پیداوار میں لوگوں کے ان باہمی تعلقات کی کل میزان ہے سماج کا معاشی ڈھانچہ یا وہ اصلی داغ بیل جس پر قانون اور سیاست کی عمارتیں چنی جاتی ہیں ۔ اور سماجی شعور کی مختلف شکلیں بھی اسی سے مناسبت رکھتی ہیں ۔ مادی زندگی کا طریق پیداوار ہی عام طور سے زندگی کی سماجی، سیاسی اور ذہنی عمل کی راہیں متعین کرتا ہے ۔ وہ لوگوں کا شعور نہیں ہے جو زندگی کا رخ تعین کرتا ہو بلکہ اس کے برخلاف لوگوں کی سماجی زندگی ان کے شعور کا رخ مقرر کرتی ہے ۔ سماج کی مادی پیداواری طاقتیں جب ترقی کر کے ایک خاص مرحلے پر پہنچتی ہیں تو اس وقت کے پیداوار میں قائم شدہ تعلقات سے ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے، یا اگر قانونی لفظوں میں کہنا ہو تو یوں کہیں گے کہ پیداواری طاقتیں ملکیت کے ان تعلقات سے ٹکرا جاتی ہیں جن کے ہوتے وہ اب ترقی کرتی رہی تھیں ۔ پیداوار میں یہ تعلقات اب تک تو پیداواری طاقتوں کی ترقی کی شکل تھے، اب وہ ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں ۔ تب سماجی انقلاب کا دور شروع ہوتا ہے ۔ معاشی اقتصادی بنیاد بدل جانے کے ساتھ کم وبیش تیزی کے ساتھ اوپر استوار عمارتوں کی بھی کایا پلٹ ہو جاتی ہے ۔ جب اس کایا پلٹ پر غور کیا جائے تو لازم ہے کہ پیداوار کے معاشی حالات میں اس مادی تبدیلی کو، جسے قدرتی سائنسوں کی سی ناپ تول کے ساتھ قطعی طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے، ان قانونی، سیاسی، مذہبی، فنی اور فکری مختصر یہ کہ ان نظریاتی شکلوں سے شناخت کرنا چاہئے جن کے ذریعے لوگ اس تصادم یا ٹکراؤ کا اظہار کرتے ہیں اور جن میں اس ٹکراؤ سے نکلنے کے لئے طاقت لگاتے ہیں ۔ جس طرح ہم کسی آدمی کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں یہ نہیں دیکھتے کہ وہ خود اپنے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، عین اسی طرح کایا پلٹ کے کسی خاص دور پر فتویٰ دیتے وقت اس دور کے شعور کو بنیادی وجہ

نہیں مان لینا چاہئے۔اس کے برخلاف ہونا یہ چاہئے کہ اس شعور یا سوجھ بوجھ کی وجہ معلوم کی جائے مادی زندگی کے تضاد میں، اوراس بات میں کہ سماجی پیداواری طاقتوں کے اور پیداوار میں انسانی تعلقات کے درمیان کون سا ٹکراؤ چل رہا تھا۔ کوئی سماجی نظام اس وقت تک تلپٹ نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ تمام پیداواری طاقتیں جن کے پنپنے کی اس نظام میں گنجائش ہوتی ہے، خوب پھل پھول نہ چکی ہوں، پیداوار میں نئے اور زیادہ بلند سطح کے تعلقات اس وقت تک کبھی نہیں ابھرتے جب تک کہ اسی پرانے سماج کے وجود کے اندر سے اس کے لئے مادی حالات اور اسباب پک کر تیار نہ ہوجائیں۔یہی وجہ ہے کہ عالم انسانیت اپنے ذمے وہی فریضے لیتا ہے جو وہ پورے کر سکے، چنانچہ اگر زیادہ غور کیا جائے تو ہمیشہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ خود فریضہ بھی تبھی سامنے آتا ہے جب اس کے لئے مادی حالات یا تو موجود ہوں یا کم از کم اتنا ہو کہ آگے بڑھتے بڑھتے کسی مقام پر ان کی نوبت آجائے۔موٹے اندازے سے یوں کہیں گے کہ ایشیائی قدیم یونانی جاگیرداری اور موجودہ زمانے کا بورژوائی طریقہ پیداوار۔ان سب کو معاشی سماجی بناوٹ کے درجہ بدرجہ مختلف دور سمجھنا چاہئے۔پیداوار میں جو بورژوائی تعلقات ہیں وہ پیداوار کے سماجی عمل میں تناتنی کی ایک آخری شکل ہیں، مطلب یہ نہیں کہ کوئی ذاتی کشاکش ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ افراد کی زندگی کے سماجی حالات سے یہ تناتنی اور ٹکراؤ کی صورت نکلتی ہے۔یہی پیداواری طاقتیں جو بورژوائی سماج کے وجود کے اندر پنپتی ہیں، اس تناتنی سے نکلنے کے مادی حالات و اسباب بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ بورژوائی سماجی بناوٹ کے ہاتھوں انسانی سماج کے مقابل تاریخ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

جب سے فریڈرک اینگلز کا وہ شاندار خاکہ شائع ہوا جو انہوں نے اقتصادی درجوں کی تنقید پر لکھا تھا (فریڈرک اینگلس "سیاسی معاشیات کی تنقید پر ایک نظر" Deutsch Franzosische Jahrbucher اخبار میں) میں ان کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعے برابر تبادلہ خیالات کرتا رہا اور اینگلز دوسرے راستے سے (ملاحظہ ہو ان کی تصنیف "انگلینڈ میں مزدور طبقے کی حالت 1844 میں" اسی نتیجے پر پہنچے جس پر میں پہنچا تھا اور جب 1845 میں انہوں نے بھی برسلز شہر کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا تو ہم نے فیصلہ کیا کہ مل کر جرمن فلسفے کے نظریاتی خیالات کے تو ڑپر اپنے خیالات کا پورا نقشہ تیار کریں، یا اصلیت میں، اپنے تب تک کے فلسفیانہ ضمیر کا حساب صاف کر دیں۔ اس فیصلے نے عملی جامہ یوں پہنا کہ ہیگل کے بعد کے فلسفے کی تنقید لکھی گئی اس کتاب کا مسودہ (مارکس، اینگلز "جرمن آئیڈیالوجی") جو آٹھ ورق فی جزو کے حساب سے دو موٹی موٹی جلدوں میں تھا، ویسٹ فالیا میں اشاعت کے انتظار میں بہت دن پڑا رہا یہاں تک کہ ہمیں اطلاع دی گئی کہ حالات بدل جانے سے اب اس مسودے کی چھپائی نہیں ہو سکتی۔ ہم نے بڑی خوشی سے وہ مسودہ چوہوں کی کٹیلی تنقید کے سپرد کر دیا کیوں کہ ہمارا جو اصل مقصد تھا کہ مسئلہ اپنی نظر میں صاف ہو جائے، وہ مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ اور ان مختلف تحریروں میں سے، جو ہم نے اپنے نقطہء نظر کی کسی نہ کسی سمت سے تشریح کے خیال سے ان دنوں پبلک کے سامنے پیش کی تھیں، یہاں صرف چند کا تذکرہ کر دوں، ایک وہ، جس کی تصنیف میں اینگلز اور میں شریک ہیں، " کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو" اور ایک "تجارت کی آزادی پر بیان" جو خود میں نے شائع کرایا تھا۔ ہمارے خیالات کے فیصلہ کن نکتے پہلی بار علمی طریقے سے، اگر چہ ان میں مناظرے کا رنگ تھا، میری تصنیف "فلسفے کا

افلاس" میں پیش ہوئے جو 1847 میں شائع ہوئی اور اس کا رخ تھا فلسفی پرودھوں کے خلاف۔ "مزدوری اور سرمایہ" (اسی سلسلے کے حصہ اول میں شامل ہے۔) نام کا ایک مقالہ، جہاں میں نے اس موضوع پر بروسلز جرمن ورکرز سوسائٹی (6) کے سامنے دیے ہوئے اپنے سب لکچر جرمن زبان میں لکھے ہوئے جمع کر دیے تھے، ابھی پریس میں تھا کہ فروری 1848 کے انقلاب (7) اور اس کے بعد برسلز سے میرے نکالے جانے کے سبب اشاعت سے رہ گیا۔

1848 اور 1849 کے زمانے میں Neue Rheinische Zeitung اخبار کی ایڈیٹری نے اور اس کے بعد کے واقعات نے معاشیات پر میرے مطالعے کا سلسلہ توڑ دیا جو لندن پہنچ کر کہیں 1850 میں پھر جاری ہوا۔ برٹش میوزیم میں سیاسی معاشیات کی تاریخ کے موضوع پر جو زبردست ذخیرہ موجود ہے، وہ اور اس کے علاوہ خود لندن جو بورژوائی سماج کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کے لئے بڑے موقع کی جگہ ہے اور اوپر سے اس سماج کی ترقی کا تازہ ترین مرحلہ جس میں سب سے تازہ کیلی فورنیا (امریکہ) اور آسٹریلیا میں سونے کی دریافت ہونا شامل ہے، ان حالات نے مجھ سے یہ فیصلہ کرایا کہ پھر شروع سے ہی مطالعہ کرنا چاہئے اور نئے میٹریل میں خوب چھان بین کرنی چاہئے۔ اس طرح لگ کر کام کرنے سے، کچھ تو یہ مطالعہ بجائے خود ایسے سوالوں کی طرف کھینچ لے گیا جو پہلی نظر میں اصل مضمون سے قطعی بے تعلق معلوم ہوتے تھے، لیکن ان پر مجھے تھوڑا بہت اور جم کر کام کرنا پڑا۔ کام کی جتنی مہلت ملی اس کا بھی ایک حصہ یوں کٹ گیا کہ گزر اوقات کے لئے کچھ کام کرنا اور وقت خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اب مجھے پہلے انگریزی امریکی اخبار New York Daily Tribune (9) کے لئے کام کرتے

آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ (اخبار کے لئے میں یوں بھی کسی خاص وجہ کے بغیر نہیں لکھتا) جس سے میرے علمی مشغلوں میں غیر معمولی خلل پڑتا رہا ہے اور ان کا سلسلہ اکثر ٹوٹتا رہا ہے۔ بہر حال انگلینڈ میں اور یورپ میں اقتصادی زندگی کے نمایاں واقعات پر مضامین لکھنے کی خاطر مجھے اخباروں میں اپنی محنت کا خاصہ بڑا حصہ لگا دینا پڑا اور مجبوراً ایسی عملی تفصیلات سے بھی آگاہی حاصل کرنا ضروری ہو گیا جو سیاسی معاشیات کے اصل علمی مضمون سے باہر کی بات ہیں۔

سیاسی معاشیات کے دائرے میں اپنی مصروفیت اور مطالعے کی رفتار کا جو تذکرہ میں نے یہاں کیا ہے، اس سے صرف اتنا ہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ میرے یہ خیالات، چاہے ان کے بارے میں کوئی بھی فتویٰ دیا جائے اور حاکم طبقوں کے خود غرضانہ تعصّبات سے چاہے وہ کتنی ہی کم مطابقت رکھتے ہوں، تاہم وہ دیانتداری کے ساتھ برسوں کی تلاش اور ریسرچ کا حاصل ہیں۔ رہا علم تو اس کے دروازے پر بھی باب دوزخ کی طرح یہی نقش ہونا چاہئے کہ:

Qui si convien lasciare ogni sosopetto;

Ogni vilta convien che qui sia morta.

("لرزتے قدموں کا اس جا گزر نہیں ہوتا

نگاہ دل کو یہاں کچھ خطر نہیں ہوتا۔")

لندن، جنوری 1859

یہ دیباچہ برلن 1859 میں شائع ہونے والی کتاب (Zur Kritik der politischen Oekonomie von Karl Marx. Erstes Heft.

شائع ہوئی تھی۔

کارل مارکس

اُجرت، قیمت اور منافع Wages, Price, Profit

چند ابتدائی جملے

صاحبان!

نفس مضمون کی طرف آنے سے پہلے، شروعات کے چند جملے کہنے کی اجازت دیجئے۔

فی الحال پورے یورپ میں ہڑتالوں کی ایک وبا پھیلی ہوئی ہے اور اجرت بڑھوانے کی مانگ ہر طرف عام ہے۔ ہماری کانگرس میں یہ سوال زیر بحث آئے گا۔ آپ لوگ جو انٹرنیشنل ایسوسی ایشن (11) کے سربراہ ہیں، آپ کی رائے اس نہایت اہم مسئلے پر خوب بحث تلی ہونی چاہئے۔ لہٰذا میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مسئلے کی جڑ بنیاد تک پہنچوں اور اس کی خاطر آپ صاحبان کی قوت برداشت کو امتحان میں ڈالنے کا خطرہ بھی مول لے رہا ہوں۔

شروع کرتے وقت دوسرا ریمارک مجھے ویسٹن صاحب کی بابت دینا ہے۔ انہوں نے مزدور طبقے کے مفاد کی خدمات کے خیال سے نہ صرف آپ کے سامنے بلکہ پبلک کے سامنے کھلے طور پر ایسے خیالات کی حمایت کی ہے جو مزدور طبقے میں، جیسا کہ انہیں خبر ہوگی، انتہائی ناپسندیدہ ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں اخلاقی جرات کے ایسے اظہار کی بڑی قدر ہونی چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ اگرچہ میری تقریر کا لب ولہجہ تیکھا ہوگا، لیکن اس کے تمام ہونے پر ویسٹن صاحب دیکھ لیں گے کہ میں اس خیال سے اتفاق رکھتا ہوں جس سے انھوں نے (میرا یہ اندازہ ہے)

اپنے نظریاتی مقالے کی تیاری وترتیب میں آغاز کیا ہوگا اگر چہ اب جوشکل ان مقالوں کی ابھر کرآئی وہ ایسی ہے کہ میرے خیال میں نظریاتی لحاظ سے باطل اور عملی لحاظ سے خطرناک ہوگی۔

خیر، اب میں سوال زیر بحث کی طرف آتا ہوں۔

1۔ پیداوار اور اجرت

ویسٹن صاحب کا سارا استدلال دو قیاسوں پر رکھا ہوا ہے:

اول یہ کہ ساری کی ساری قومی پیداوار کوئی ایک جامد چیز ہے، اس کی ایک مستقل مقدار یا علم حساب والوں کی زبان میں یوں کہیں کہ ایک قطعی حاصل جمع ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اصل اجرت کی کل رقم، یعنی سب اجرتیں مل ملا کر اس حساب سے جتنا مال وہ خرید سکتی ہوں، وہ بھی ایک جامد رقم ہے اور اس کا حاصل جمع بھی قطعی ہوتا ہے۔

اب یہ پہلا ہی دعویٰ صاف غلط نکلتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سال بسال پیداوار کی ویلیو اور کل مقدار بڑھتی جاتی ہے، قومی محنت کی پیداواری طاقت برابر بڑھ رہی ہے، اور بڑھتی ہوئی پیداوار کو گردش میں رکھنے کے لئے جتنی نقد رقم کا ہونا لازمی ہے، اس کی مقدار بھی لگاتار بدلتی جارہی ہے۔ ایک دوسرے سے مقابلہ یا موازنہ کرتے وقت جو بات پورے سال کے لئے یا مختلف برسوں کے لئے درست ہے، وہی کسی سال کے مختلف دنوں یا ہر ایک دن کے لئے درست ٹھہرتی ہے۔ قومی پیداوار کی کل مقدار یا حاصل جمع لگاتار بدلتی رہتی ہے۔ اس حاصل جمع کو ثبات نہیں، تغیر ہے۔ آبادی کی تعداد میں جو کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس سے اگر قطع نظر کرلیا جائے،

تب بھی قومی پیداوار کی کل مقدار ایک حال پر اس وجہ سے نہیں رہ سکتی کہ سرمائے کا ذخیرہ ہونا اور محنت کی پیداواری طاقت یہ دونوں لگاتار بدلتے رہتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ اگر کسی روز اجرتوں کا عام معیار چڑھ جائے تو چاہے بعد میں کچھ بھی نتیجے نکلیں، تاہم صرف اس معیار کے چڑھ جانے سے پیداوار کے حاصل جمع پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو صورت حال اس وقت ہوگی شروع میں اسی کی بنیاد پر کام چلتا رہے گا۔ لیکن اگر قومی پیداوار اجرتیں بڑھ جانے سے پہلے تک کوئی جامد نہیں بلکہ متحرک یا بدلتی رہنے والی کل مقدار ہے تو پھر اجرتیں بڑھ جانے کے بعد بھی وہ جامد نہیں بلکہ متحرک ہی رہے گی۔

اچھا فرض کریں کہ قومی پیداوار کی کل مقدار متحرک نہیں بلکہ جامد یا ایک حال پر رہنے والی ہے۔ تب بھی وہ بات جسے ہمارے دوست ویسٹن ایک منطقی نتیجہ سمجھ رہے ہیں لفظی الٹ پھیر کے سوا اور کچھ نہیں ٹھیرتی۔ اگر ایک مقررہ عدد ہمارے سامنے ہے، فرض کیجئے آٹھ ہے، تو آٹھ کے عدد کی جو واقعی حد ہے، اس کے اندر رہ کر باقی دوسرے عدد اپنی باہمی نسبت آسانی سے بدل سکتے ہیں۔ اس آٹھ کے عدد میں اگر منافع کا عدد چھ ہے اور اجرت کا دو تو یہ ممکن ہے کہ اجرت بڑھ کر چھ ہو جائے اور منافع دو رہ جائے۔ یوں بھی دونوں کی جمع آٹھ ہوگی۔ پس معلوم ہوا کہ پیداوار کی کل مقدار کے بدلنے کا کسی صورت میں بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اجرتوں کی کل مقدار بھی ایک حال پر رہی ہو۔ اس صورت میں ہمارے دوست ویسٹن کیونکر ثابت کرتے ہیں کہ اجرت کی کل مقدار ایک حال پر رہتی ہے؟ ثابت ہی نہیں کرتے، اس پر اصرار کرتے ہیں، چلئے، ان کا یہ اصرار بھی مان لیا۔ تب تو اسے دونوں سمتوں میں کارگر ہونا چاہیئے، لیکن وہ صرف ایک سمت میں اسے کارگر

دکھاتے ہیں۔ اگر اجرتوں کی کل مقدار ایسی حاصل جمع کا نام ہے جو بدلتی نہیں، تو پھر نہ وہ بڑھنی چاہیے، نہ گھٹنی۔ مطلب یہ کہ اگر مزدور عارضی طور سے اپنی اجرتیں بڑھوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی یہ حرکت معقول نہیں ہے، تب سرمایہ داروں کی بھی یہ حرکت نامعقول ہوئی کہ وہ عارضی طور سے ان کی اجرتیں گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے دوست ویسٹن کو اس سے انکار نہیں کہ خاص حالات میں مزدور یہ کر سکتے ہیں کہ سرمایہ داروں کو مجبور کر کے اپنی اجرتیں بڑھوالیں، لیکن چونکہ اجرتوں کی کل مقدار قدرتی طور سے معین معلوم ہوتی ہے، اس لیے اجرتیں بڑھوالینا آخر رنگ لائے گا۔ دوسری طرف سے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سرمایہ دار یہ کر سکتے ہیں کہ اجرتیں گھٹا دیں اور سچ پوچھئے تو وہ مستقل اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن اجرتوں کی مجموعی مقدار ایک حال پر رہنے کا اصول یہ کہتا ہے کہ اجرتیں گھٹانا بھی، اجرتیں بڑھوا لینے کی طرح رنگ لاتا ہے۔ چنانچہ اجرتیں گھٹائے جانے یا گھٹانے کی کوشش ہونے کے جواب میں محنت کش صحیح کارروائی کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے یہ صحیح کارروائی ہے کہ اپنی اجرتیں بڑھوائیں کیونکہ اجرتیں گھٹانے کی جوابی کارروائی یہی ہوگی کہ اجرتیں بڑھوانے کے لئے کارروائی کی جائے۔ ویسٹن صاحب کے نزدیک اجرتوں کے ایک حال پر رہنے کا اصول یہ کہتا ہے کہ محنت کشوں کو بعض خاص حالات میں یہ کرنا چاہیے کہ اجرتیں بڑھوانے کے لئے متحد ہوں اور اس کی پوری کوشش کریں۔

اگر انہیں اس نتیجے سے انکار ہے تو پھر جس قیاس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اسی قیاس سے انکار کریں۔ انہیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اجرتوں کی کل مقدار ایک جامد مقدار ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اجرتوں کی کل مقدار نہ تو بڑھ سکتی ہے اور نہ اسے بڑھنا چا

ہیے البتہ جب بھی سرمایہ مناسب جانے، وہ گھٹ سکتی ہے اور اسے گھٹ جانا چاہیے۔ اگر سرمایہ دار کے دل میں نیکی آئے کہ وہ آپ کو گوشت کی جگہ آلو اور گیہوں کے بجائے جوکھلائے تو آپ اس کی یہ مرضی سیاسی معاشیات کا قانون سمجھ کر پوری کیجئے اور اس کے سامنے سر جھکا دیجئے۔ اب اگر ایک ملک میں اجرتیں دوسرے ملک کی اجرتوں سے زیادہ ہیں، مثلاً یہ کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں انگلینڈ سے زیادہ ہیں تو آپ اجرتوں کے معیار کے اس فرق کی یہ تشریح کر سکتے ہیں کی امریکی سرمایہ دار کی مرضی اور برطانوی سرمایہ دار کی مرضی میں فرق پڑتا ہے، یہ ایسی ترکیب ہے جو صرف معاشی اقتصادی مظاہر کو ہی نہیں بلکہ اور تمام مظاہر کے مطالعے کو بھی بے حد آسان اور سیدھا سادہ بنا دیتی ہے۔

پھر اس معاملے میں بھی ہم وہی سوال اٹھا سکتے ہیں: آخر امریکی سرمایہ دار کی مرضی برطانوی سرمایہ دار کی مرضی سے مختلف کیوں ہے؟ اس کا جواب دینے کے لیے آپ کو مرضی کے دائرے سے باہر کہیں جانا پڑے گا۔ ایک پادری یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا کی مشیعت فرانس میں اور ہے اور انگلینڈ میں کچھ اور۔ اس پر بھی اگر میں اصرار کروں کہ آخر پروردگار کے ہاں مشیعت کی یہ دوئی کیوں ہے تو وہ ہچکچائے بغیر جواب دے سکتا ہے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے، فرانس میں اس کی ایک مرضی ہے، انگلینڈ میں دوسری۔ مگر ظاہر ہے کہ ہمارے دوست ویسٹن اس قسم کی دلیل میں پناہ نہیں لینے والے جہاں کسی طرح کے استدلال کی گنجائش نہ رہے۔

اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دار کی مرضی ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ وصول کر سکے، کر لے۔ لیکن ہمارا کام یہ نہیں کہ اس کی مرضی کی تشریح کرتے پھریں بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ سرمایہ دار کی طاقت کا کھوج لگائیں، اس طاقت کی حدوں کا اور

ان حدوں کی نوعیت کا پتہ لگائیں۔

(2) پیداوار، اجرت اور منافع

ویسٹن صاحب نے جو خطبہ ہمیں سنایا ہے اس کا لب ولباب پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان کی ساری دلیلیں گھوم پھر کر یہیں آتی ہیں کہ: اگر مزدور طبقہ سرمایہ دار طبقے کو مجبور کر کے نقد اجرت کی صورت میں چار کے بجائے پانچ شلنگ وصول کرتا ہے تو سرمایہ دار اس کے جواب میں جو سامان دے گا وہ پانچ کا نہیں، چار شلنگ کی مالیت کا ہوگا۔ اب مزدور طبقے کی جیب سے اسی سامان کے پانچ شلنگ جائیں گے جس کے وہ اجرت بڑھنے سے پہلے چار شلنگ دیا کرتا تھا۔ مگر ایسا ہوتا ہی کیوں ہے؟ سرمایہ دار پانچ شلنگ کے بدلے میں صرف چار شلنگ کی مالیت کا سامان ہی کیوں دیتا ہے؟ کیونکہ اجرت کی رقم مقرر ہے۔ مگر وہ چار شلنگ کی مالیت کے سامان پر ہی کیوں ٹھہری ہوئی ہے؟ تین یا دو شلنگ یا کسی اور رقم پر کیوں مقرر نہیں؟ اگر اجرت کی رقم کی حد کسی معاشی قانون سے طے پاتی ہے، وہ نہ سرمایہ دار کی مرضی کی تابع ہے، نہ محنت کش کی مرضی کی پابند۔ تو ویسٹن صاحب کو پہلا کام یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ قانون بیان کریں اور اسے ثابت کر دیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی ثابت کرنا چاہیے تھا کہ اجرت کی رقم جو کسی ایک وقت میں ادا کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اتنی ہی ہوتی ہے جسے لازمی رقم شمار کیا جائے۔ اس تناسب سے کبھی ادھر یا ادھر نہیں ہوتی۔ اب اگر ایسا ہوتا کہ اجرت کی موجودہ رقم کی حدیں یا تو سرمایہ دار کی محض ذاتی مرضی پر منحصر ہوتیں یا اس کے لالچ کی حدوں کی پابند ہوتیں تو یہ حدیں من مانی ہیں، ان میں کچھ بھی لازمی اور قطعی نہیں، سرمایہ دار کی مرضی کے مطابق بھی بدل سکتی ہیں اور

مرضی کے خلاف بھی۔

ویسٹن صاحب نے اپنے نظریے کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ اگر ایک دیگچی میں شوربے کی مقررہ مقدار سماتی ہے جو گنتی کے مقررہ آدمیوں کے لئے تیار کی گئی ہے، چمچہ یا کفگیر اگر اور بڑا ہو جائے تو اس سے شوربے کی مقدار نہیں بڑھ جائے گی۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ اس مثال میں چمچہ بہت پھرا دیا گیا ہے۔ اس پر مجھے ایک ایسا ہی واقعہ یاد آ گیا جسے مینی آگریپا نے بیان کیا ہے۔ جب روم کی رعایا (plebeians) نے روم کے آقاؤں (patricians) کے خلاف ہڑتال کی تو آقا آگریپا نے ان سے کہا کہ پتریشین (مالک) پیٹ سے ملک کے بدن کے پلیبین (رعیت) اعضا کو غذا پہنچتی ہے۔ تاہم وہ یہ کہنے سے چوک گیا کہ ایک کا پیٹ بھر کر دوسرے کے اعضا کو غذا پہنچائی جا سکتی ہے۔ ویسٹن صاحب بھی چوک گئے کہ جس دیگچی سے محنت کشوں کو غذا ملتی ہے وہ قومی محنت کی پوری پیداوار سے بھری جاتی ہے، وہ چیز جو انھیں دیگچی میں سے کچھ زیادہ لینے سے روکتی ہے وہ دیگچی کا چھوٹا ہونا یا اس کے اندر کا کال تھوڑا ہونا نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ ان کے چمچے چھوٹے ہیں۔ وہ کونسی ہوشیاری ہے جس سے ایک سرمایہ دار یہ راستہ نکال لیتا ہے کہ چار شلنگ کی مالیت پانچ شلنگ میں دے؟ جو مال اسے فروخت کرنا ہے اس کی قیمت بڑھا کر یہ راستہ نکالا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قیمت کا بڑھنا، بلکہ عام طور سے مال کی قیمتوں کا گھٹنا بڑھنا یا مال کی قیمتیں محض سرمایہ دار کی مرضی پر منحصر ہیں؟ یا یوں ہے کہ اس مرضی کو عمل میں لانے کے لئے کچھ اور شرطوں کا ہونا لازم ہے؟ اگر ان حالات کا، ان شرائط کا تقاضا نہ ہو تو بازار بھاؤ کا تیز یا مندا ہونا، اس کا لگاتار بدلتے رہنا ایک بن بوجھی پہیلی بن جائے۔

اگر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ نہ تو محنت کی قوت پیداوار میں کوئی تبدیلی ہوئی، نہ سرمائے اور محنت کی اس مقدار جو لگی ہوئی ہے میں کوئی فرق پڑا، نہ روپے کی اس مالی حیثیت میں فتور آیا جس کے ذریعے سامان کی قیمتیں لگائی جاتی ہیں۔ بلکہ صرف اجرت کے معیار میں فرق آیا ہے تو پھر وہ کون سا طریقہ ہے جس سے اجرتوں کے بڑھ جانے کا اثر مال کی قیمتوں پر پڑ جاتا ہے؟ اجرتوں کا بڑھنا قیمتوں پر صرف اسی صورت میں اثر ڈالتا ہے کہ مال کی مانگ اور سپلائی کے درمیان جو اصلی نسبت ہے اس نسبت کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ مزدور طبقہ۔ اس کی پورے تعداد نظر میں رکھئے تو۔ اپنی آمدنی سب سے مقدم ضروریات پر خرچ کرتا ہے اور اس خرچ پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے جوں ہی اجرتوں کا معیار عام طور پر اونچا اٹھتا ہے، ضروریات کی اب سے مقدم چیزوں کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ بازار بھاؤ بھی اسی کے ساتھ بڑھ جاتے ہیں۔ بازار میں آنے والا یہ سامان جن سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکلتا ہے، وہ اگر ایک طرف اجرت بڑھاتے ہیں تو دوسری طرف اپنے سامان کے بازار بھاؤ بڑھا کر حساب برابر کر لیتے ہیں۔ مگر ان سرمایہ داروں کا کیا بنے گا جو سب سے مقدم ضروریات کا سامان تیار نہیں کرتے؟ ایسے سرمایہ دار کچھ کم ہوں گے، یہ سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ اگر آپ یہ دھیان میں رکھیں کہ قومی پیداوار کی سوتہائی کا استعمال آبادی کا صرف پانچواں حصہ کرتا ہے۔ بلکہ حال میں ہی دارالعوام کے ایک ممبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آبادی کا صرف ساتواں حصہ ان کا استعمال کرتا ہے۔ تو سوچنے کی بات ہے کہ قومی پیداوار کا کتنا زبردست حصہ صرف عیش و آسائش کے سامان کے طور پر تیار کیا جاتا ہے یا ایسے سامان سے اس کا تبادلہ کیا جاتا ہے، اور مقدم ضروریات زندگی کا کتنا زبردست حصہ ہوگا جو فالتو خدمتگاروں پر،

گھوڑوں، بلیوں وغیرہ پر ضائع کیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے تجربے سے معلوم ہے کہ جوں ہی مقدم ضروریات زندگی کے سامان کے بھاؤ بڑھنے لگتے ہیں، اس فضول خرچی کی حدیں ہمیشہ سکڑ جاتی ہیں۔

خیر، تو ان سرمایہ داروں کی پوزیشن کیا ہوگی جو ضروریات زندگی کا سامان تیار نہیں کرتے؟ کیونکہ اجرتیں عموماً بڑھ جانے سے ان کے منافع کی شرح تو گرے گی اور وہ اپنے مال کے بھاؤ بڑھوا کر اس لئے حساب برابر نہیں کر سکتے کہ اس مال کی مانگ نہیں بڑھتی۔ ایسے سرمایہ داروں کی آمدنی گھٹے گی اور گھٹنے پر بھی انہیں ضروریات کا مہنگا سامان خریدنے کے لئے زیادہ خرچ کرنا پڑے گا۔ مگر یوں نہیں ہوتا۔ جب ان کی آمدنی گھٹتی ہے تو انہیں عیش و آسائش کے سامان پر اپنا خرچ گھٹانا پڑتا ہے اور اس صورت میں خود انہی کے اپنے مال پر آپس میں ایک دوسرے کی مانگ بھی گھٹتی چلی جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے نتیجہ یہ کہ ان کے مال کی قیمتیں گرتی ہیں۔ اس کا اثر یہ کہ صنعت کی ان شاخوں میں منافع کی شرح اتر جاتی ہے اور یہ اجرتوں کا معیار عام طور پر بڑھ جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اجرتوں کا معیار عموماً بڑھ جانا، مقدم ضروریات کی چیزوں کے بھاؤ چڑھ جانا اور عیش و آسائش کے سامان کی قیمتوں کا گر جانا، سب مل کر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ صنعت کی مختلف شاخوں میں لگے ہوئے سرمایوں کو جب منافع کی شرح میں یہ فرق پڑے کا تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ لازمی بات ہے کہ وہی نتیجہ نکلے گا جو چاہے کسی حالت میں بھی ہو اور کسی سبب سے بھی ہو، لیکن پیداوار کے مختلف دائروں میں اوسط شرح منافع پر فرق پڑنے سے نکلتا۔ سرمایہ اور محنت دونوں کم نفع کی شاخوں سے نکل کر زیادہ نفع والی شاخوں کا رخ کرتے ہیں اور ایک سے دوسری میں ڈھلنے کا

یہ سلسلہ تب تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ صنعت کی بعض شاخوں میں مال کی سپلائی بڑھتی ہوئی مانگ سے میل نہ کھائے اور صنعت کی دوسری شاخوں میں سپلائی کم ہوتے ہوتے گھٹی ہوئی مانگ کے برابر نہ آجائے۔ جب دونوں پلڑوں میں یہ ادل بدل ہو چکتی ہے تو صنعت کی مختلف شاخوں میں شرح منافع کا اوسط ایک سا ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ ساری اونچ نیچ شروع ہوئی تھی صرف اس بات سے کہ مختلف مالوں کی رسد اور طلب کے باہمی توازن میں فرق پڑ گیا تھا، لہذا سبب دور ہونے پر اس کا اثر بھی جاتا رہا اور قیمتیں پھر پہلے کی سطح پر اور باہمی توازن پر پہنچ گئیں۔ منافع کی شرح کا گرنا، جو اجرتیں بڑھنے کا نتیجہ ہوتا ہے، صنعت کی بعض شاخوں تک محدود رہنے کے بجائے سب میں عام ہو جاتا ہے۔ ہم نے جو فرض کیا تھا اس کی رو سے، نہ تو محنت کی قوت پیداوار میں فرق پڑا، نہ پیداوار کی کل میزان میں، البتہ تیار ہونے والے سامان کی کل مقدار کی صرف شکل بدل گئی۔ چنانچہ اب تیار ہونے والے سامان کا بڑا حصہ سب سے مقدم ضروریات زندگی کی شکل میں موجود ہے اور تھوڑا حصہ آسائش کے سامان کی صورت میں، یا اسی کو یوں کہیں کہ تھوڑا حصہ ایسا ہے جو عیش و آسائش کے بدیسی سامان سے بدلا جارا ہے اور بیشتر اپنی اصل شکل میں ہی کھپ جاتا ہے، یا پھر اسی بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ دیسی پیداوار کا بڑا حصہ ایسا ہے جو آسائش کے سامان کے بدلے میں نہیں بلکہ بدیسی سامان ضرورت کے تبادلے میں جاتا ہے۔ لہذا جب اجرتوں کا معیار عام طور سے اونچا ہوتا ہے تو بازار کے بھاؤ میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ضرور آتی ہے، لیکن اس کے اثر سے صرف منافع کی شرح عام طور پر گر جاتی ہے۔ البتہ یہ نہیں ہوتا کہ مال کی قیمتوں میں کوئی مستقل تبدیلی ہو جائے۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ اوپر جو دلیل دی ہے اس میں یہ فرض کر کے چلا ہوں کہ اجرت میں جتنا اضافہ ہوگا وہ سارے کا سارا مقدم ضروریات زندگی پر خرچ ہو جائے گا تو جواب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میں نے فرض کرنے میں ویسٹن صاحب کی سہولت کو مدنظر رکھا ہے۔ اگر اجرت کے اضافے کی رقم ایسی چیزوں پر خرچ ہونے لگے جو مزدور پہلے استعمال نہیں کیا کرتے تھے تو پھر یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ مزدوروں کی اصل قوت خرید بڑھ گئی۔ تاہم چونکہ ان کی قوت خرید کا یہ اضافہ محض اجرت کے بڑھنے کا نتیجہ ہے، اس لئے جس نسبت سے اجرت بڑھے اسی نسبت سے سرمایہ داروں کی قوت خرید گھٹنی چاہئے۔ اگر ایسا ہوتا تو مال کی جتنی مانگ ہوتی ہے اس کا عام ناپ تول نہ بڑھتا بلکہ مانگ کے اندر ضروریات اور آسائش کے سامانوں کا تناسب بدل جاتا۔ ایک طرف سے پلہ جھکتا تو دوسری طرف سے اٹھ جاتا۔ اور پھر چونکہ مانگ کی مجموعی مقدار جوں کی توں بنی رہتی تو مال کے بازار بھاؤ میں بھی کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے تھا۔ یہاں ایک اور گتھی پڑتی ہے: یا تو یوں ہے کہ اجرتوں کا اضافہ استعمال کی سبھی چیزوں پر مساوی حیثیت سے خرچ ہوتا ہے، اس صورت میں مزدور طبقے کی طرف سے مانگ بڑھنے میں سرمایہ دار طبقے کی طرف سے مانگ گھٹنا لازم آتا ہے، یا پھر یوں ہے کہ اجرتوں کا اضافہ استعمال کی صرف بعض چیزوں پر خرچ ہوتا ہے جن کا بازار بھاؤ عارضی طور سے تیز ہو جاتا ہے، اس صورت میں صنعت کی بعض شاخوں میں شرح منافع کا گرنا یہ رنگ لائے گا کہ سرمایہ اور محنت اپنے اپنے ٹھکانے بدلیں اور تب تک بدلتے رہیں جب تک کہ کسی کسی صنعت میں سپلائی بڑھی ہوئی مانگ سے میل نہ کھائے اور دوسری صنعت میں گھٹتے گھٹتے وہ نہ آجائے۔ اگر ہمارا پہلا فرض درست ہے تو مال کی قیمتوں میں کسی قسم کی کو

ئی تبدیلی نہیں ہونے والی، اور اگر دوسرا درست ہے تو بازار بھاؤ میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ہونے کے بعد مال کی قوت تبادلہ وہیں آ کر ٹھہرے گی جہاں وہ پہلے تھی۔ دونوں مفروضوں کا حاصل یہ ہوا کہ اجرتوں کا عام معیار بڑھ جانے سے اگر کوئی آخری نتیجہ نکلنے والا ہے تو وہ صرف اسی قدر ہے کہ شرح منافع عام طور سے گر جائے۔

آپ کے تخیل پر زور دینے کی خاطر ویسٹن صاحب تجویز کرتے ہیں کہ ذرا آپ غور فرمائیں اور ان مشکلات کا اندازہ کریں جو انگلستان کے فارموں میں کام کرنے والوں کی اجرت نو کے بجائے اٹھارہ شلنگ کر دینے سے پیش آئیں گی۔ وہ آپ کو چونکاتے ہیں کہ ذرا غور تو کیجیے؛ ایسا ہوا تو مقدم ضروریات زندگی کی مانگ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی اور اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ قیمتیں بڑھتے بڑھتے بھیانک حد کو پہنچیں گی۔ آپ صاحبان واقف ہیں کہ امریکہ کے فارموں میں کام کرنے والوں کا اوسط اجرت انگلستان کے فارموں کے مزدوروں سے دوگنے سے بھی کچھ زیادہ ہے اگرچہ امریکہ میں زراعتی پیداوار کا سامان برطانیہ عظمیٰ کے مقابلے میں سستا ہے، اور محنت اور سرمائے کے درمیان عام تعلقات امریکہ میں بھی وہی ہیں جو انگلینڈ میں ہیں، اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سالانہ پیداوار انگلینڈ کی سالانہ پیداوار بہت کم ہے۔ تو پھر ہمارے یہ دوست کیوں خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں؟ صرف اس خیال سے کہ ہمارے سامنے جو اصل سوال ہے وہ ٹل جائے۔ اجرت کا نو سے ایک دم اٹھارہ شلنگ ہو جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اجرت ایکا ایکی سو فیصدی بڑھ جائے۔ مگر سوال زیر بحث یہ ہے ہی نہیں کہ کیا انگلستان میں اجرت کا عام میعار ایک دم سو فیصدی بڑھ سکتا ہے؟ ہمیں اس بات سے قطعی کوئی واسطہ نہیں کہ اجرت کا اضافہ کس قدر ہو کیونکہ جہاں بھی یہ سوال اٹھے گا خود وہاں کے حالات پر

منحصر ہوگا اور انہی کی مناسبت سے وہ فیصلہ ہوگا۔ ہمیں تو صرف اتنی بات صاف کرنی ہے کہ اگر اجرتوں کا معیار عام طور سے بڑھے، چاہے وہ ایک فیصدی سے بھی آگے نہ بڑھے، چاہے وہ ایک فیصدی سے بھی آگے نہ بڑھے، تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

ہمارے دوست ویسٹن نے اجرت میں سو فیصدی اضافے کے جو خیالی گھوڑے دوڑائے ہیں، انہیں رد کر کے میں آپ کی توجہ اس طرف لانا چاہتا ہوں کہ 1849 سے 1859 کے عرصے میں برطانیہ عظمیٰ کے اندر اجرتیں واقعی کتنی بڑھی ہیں۔

آپ سب پر روشن ہے کہ 1848 میں دس گھنٹے کام کا بل پیش کیا گیا تھا (12)۔ یہ ایک نہایت اہم اقتصادی تبدیلی تھی جو ہماری آنکھوں کے سامنے آئی۔ اس بل کا مطلب تھا کہ اجرتیں ایک دم اور لازمی طور سے بڑھائی جائیں، کسی ایک مقامی کاروبار میں نہیں بلکہ صنعت کی ان نمایاں شاخوں میں جن کے سہارے انگلستان عالمی منڈی پر حاوی ہوگیا ہے۔ اجرتوں میں یہ اضافہ ایسے حالات میں کیا گیا جو نہایت ہی ناسازگار تھے۔ ڈاکٹر یور، پروفیسر سینئر اور ان تمام ماہرین معاشیات نے جو بورژوازی کے حق میں سرکاری ترجمانی کرتے ہیں، ثابت کو دیا تھا، بلکہ میں کہوں کہ ہمارے دوست مسٹر ویسٹن کی منطقی دلیلوں سے کچھ زیادہ ہی گہرے اتر کر ثبوت فراہم کر دیے تھے کہ دس گھنٹے کام کے بل نے انگریزی صنعت کی موت کی سنانی دی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا تھا کہ یہ صرف اجرتیں بڑھانے کا سیدھا سا معاملہ نہیں ہے بلکہ اجرتوں میں اس قسم کے اضافے کا سوال ہے جو لگنے والی محنت کی مقدار کم کیے جانے کا نتیجہ بھی ہے اور اس پر مبنی بھی۔ ان لوگوں نے اس با

ت پر زور دیا تھا کہ سرمایہ دار کے ہاتھ سے جو کام لینے کا بارہواں گھنٹہ چھینا جا رہا ہے، یہ وہی گھنٹہ ہے جس سے وہ اپنا منافع وصول کرتا ہے۔ انہوں نے ڈرایا کہ سرمائے کا ذخیرہ کم ہونے لگے گا، قیمتیں چڑھ جائیں گی، منڈیاں ہاتھ سے نکل جائیں گی، پیداوار گھٹے گی، اس کا اثر یہ پڑے گا کہ اجرتیں گریں گی اور آخر میں بربادی پھیلے گی۔ انہوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ میکسی میلیاں روبس پیئر نے جو قوانین (Maximum Laws) (13) بنائے تھے وہ اس کے سامنے ہیچ تھے، اور ایک معنی میں ان کا کہنا تھا بھی سچ۔ لیکن پھر انجام کار کیا ہوا؟ فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی نقد اجرتیں بڑھ گئیں حالانکہ کام کے گھنٹے کم ہو گئے تھے؛ کارخانے کے مزدوروں کی تعداد میں خاصا نمایاں اضافہ ہو گیا؛ کارخانوں میں بننے والے مال کی قیمتیں برابر کم ہوتی چلی گئیں؛ کارخانے کے مزدوروں کی قوت کارکردگی میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا؛ کارخانوں کے تیار شدہ مال کی منڈیاں رفتہ رفتہ اتنی پھیل گئیں کہ پہلے کبھی گمان نہ تھا۔ 1870 کی بات ہے، مانچسٹر میں سائنس کی ترقیوں کی سوسائٹی کا ایک جلسہ تھا، جہاں میں نے خود مسٹر نیومین کو یہ اقرار کرتے سنا کہ وہ بذات خود، ڈاکٹر یور اور پروفیسر سینئر اور علم معاشیات کے تمام سرکاری نمائندے غلط نکلے، مگر عام لوگوں کی فطری سوجھ بوجھ صحیح ثابت ہوئی۔ میں پروفیسر فرینسس نیومین کے متعلق نہیں کہہ رہا ہوں، میرا روئے سخن ہے مسٹر ڈبلیو نیومین (14) کی طرف، جو معاشیات کے علم میں ایک بلند پایہ رکھتے ہیں، وہ تھومس ٹوک کی کتاب "قیمتوں کی تاریخ" میں مصنف کے شریک بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی۔ یہ ایک شاندار تصنیف ہے جو 1793 سے 1856 تک کی قیمتوں کی تاریخ کا سراغ لگاتی ہے۔ اگر ہمارے دوست ویسٹن کے دماغ میں بیٹھا ہوا خیال صحیح ہوتا

کہ اجرتوں کی کل مقدار ایک حال پر رہتی ہے، پیداوار کی کل مقدار، محنت کی پیداواری طاقت اور سرمایہ داروں کی مرضی، یہ اور دوسری چیزیں ایک حال پر قائم، بے تغیر اور قطعی رہتی ہیں تو پروفیسر سینئر کی وہ حسرت ناک پیس گوئیاں بھی کب کی صحیح ثابت ہو جاتیں اور رابرٹ اوون غلط نکلتا جس نے اب سے بہت پہلے 1815 میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کام کے گھنٹوں کا کم کیا جانا مزدور طبقے کی نجات "شرط اول قدم" ہے(15)۔اس نے عام تعصب کے سامنے سینہ سپر ہو کر اور ذاتی خطرہ مول لے کر نیو لنارک کے مقام پر اپنی ذاتی کپڑا مل میں مزدوروں کے کام کے گھنٹے کم کر کے دکھا دئے تھے۔

عین اس وقت جب دس گھنٹے کام کا قانون بنا اور اس کی بدولت اجرت میں اضافہ ہوا تو برطانیہ عظمی میں کچھ ایسے اسباب سے جن کا تفصیلی ذکر یہاں بے موقع ہو گا، فارموں میں کام کرنے والوں کی اجرتیں بھی عام طور سے بڑھتی نظر آنے لگیں۔

اس وقت جو مقصد میرے پیش نظر ہے، اگر چہ یہ اس کا تقاضا نہیں ہے تاہم اس خیال سے کہ میری بات کا غلط مفہوم نہ نکالا جائے، یہاں میں کچھ ابتدائی نکتے جتا دینا چاہتا ہوں۔

اگر کسی شخص کو ہفتے میں دو شلنگ ملتے تھے اور اب اس میں اضافہ کی وجہ سے بڑھ کر چار شلنگ تک پہنچ گئی تو اجرت کا معیار سو فیصدی بڑھا۔اگر اضافے کے معیار کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اجرت میں زبردست اضافہ ہو گیا لیکن حقیقت میں اجرت کی کل رقم ہوئی چار شلنگ فی ہفتہ، جو بجائے خود کچھ حیثیت نہیں رکھتی، پیٹ بھرنے کو بھی کافی نہیں۔اس لئے اجرت کے ناپنے میں فیصدی

کے بلند بانگ اضافی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا کچھ مناسب نہیں۔ ہمیشہ ہمارا سوال یہ ہوگا کہ اجرت کی اصل مقدار کتنی تھی؟

اب آگے دیکھئے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اگر دس مزدور ہفتے میں فی کس دو شلنگ پاتے ہیں، 5 مزدور 5 شلنگ فی ہفتہ پاتے ہیں اور 5 مزدور 11 شلنگ فی ہفتہ تو بیس آدمی کو ملا کر سو شلنگ یا پانچ پونڈ فی ہفتہ وصول ہوتا ہے۔ ان کے ہفتہ بھر کی اجرت کی مجموعی رقم میں بیس فیصدی اضافہ کیا جائے تو پانچ کی جگہ انھیں چھ پونڈ ملیں گے۔ اس کا اوسط نکالیں تو ہم کہیں گے کہ اجرت کا عام معیار بیس فیصدی بڑھا لیکن درحقیقت دس مزدوروں کی اجرت وہی رہی جو تھی، پانچ آدمی کے گروپ کی اجرت بڑھی تو فی کس پانچ کے بجائے چھ شلنگ تک ملنے لگی، اور دوسرے پانچ آدمی کے گروپ کی اجرت کی مجموعی رقم 55 سے 70 شلنگ ہوگئی۔ مزدوروں کی آدھی تعداد کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی، چوتھائی تعداد کی حالت ذرہ بھر بہتر ہوئی، صرف باقی چوتھائی کو واقعی اجرت کے اضافے کا فائدہ پہنچا۔ تاہم اگر مجموعی رقم کے حساب سے اوسط نکالی جائے تو ان بیس مزدوروں کی اجرت میں بیس فیصدی کا اضافہ ہوا۔ چونکہ یہ معاملہ پورے سرمائے کا ہے جو ان مزدوروں کو کام پر لیتا ہے اور ان کے بنائے ہوئے مال کی قیمتوں کا ہے، اس لئے انداز ایسے ہے کیا جائے گا گویا اجرت کا اوسط اضافہ سارے مزدوروں کو یکساں پہنچ گیا ہے۔ اوپر کی مثال میں اگر فارموں میں کام کرنے والوں کو رکھا جائے جن کی اجرتیں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے الگ الگ تعلقوں میں بالکل علیحدہ معیار رکھتی ہیں تو مزدوروں میں اجرتوں کے بڑھنے کا انداز ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوگا۔

آخری بات یہ کہ جن دنوں اجرتوں میں یہ اضافہ ہوا، اسی زمانے میں کئی ایسے

واقعے پیش آئے جنہوں نے مخالف سمت میں اپنا وزن ڈالا، مثلاً: نئے ٹیکس لگے جو روس سے جنگ (16) کا تقاضا تھے، فارموں میں کام کرنے والوں کے مکان بڑے پیمانے پر ڈھائے گئے (17) وغیرہ وغیرہ۔

اتنا کچھ جتا دینے کے بعد، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ 1849 سے 1859 کے درمیانی عرصے میں برطانیہ عظمیٰ کے اندر فارموں کے کام کرنے والوں کا اوسط اجرت قریب قریب چالیس فیصدی بڑھا ہے۔

میں اپنے اس دعوے کی تائید میں بہت وسیع پیمانے پر اور تفصیلی مواد پیش کرتا، لیکن پیش نظر مقصد کے لیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ مرحوم جان مارٹن نے لندن سوسائٹی آف آرٹس (18) کے جلسے میں جو نہایت محنت، تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھا ہوا مقالہ 1860 میں پیش کیا تھا اور جس کا عنوان تھا" زراعت میں استعمال ہونے والی طاقتیں" اسی کا حوالہ دے دوں۔ مسٹر جان مارٹن نے اسکاٹ لینڈ کے بارہ اور انگلینڈ کے 35 تعلقوں میں رہنے والے تقریباً سو کاشتکاروں کے بہی کھاتے، حساب اور باضابطہ کاغذات جمع کر کے ان سے اپنے نتیجے نکالے ہیں۔

ہمارے دوست ویسٹن صاحب کے خیال کے مطابق، خاص کر اگر یہ بھی نظر میں رکھا جائے کہ کارخانے کے مزدوروں کی اجرتیں بھی اس عرصے میں بڑھی ہیں تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ 1849 اور 1809 کے درمیان زراعتی پیداوار کی قیمتیں کہیں سے کہیں پہنچ جاتیں۔ مگر دراصل ہوا کیا؟ حالاں کہ روس سے جنگ بھی چل رہی تھی اور 1804 سے 1856 کی کئی فصلیں بھی خراب گئیں، پھر بھی انگلینڈ کی اصل زراعتی پیداوار یعنی گیہوں کی اوسط قیمت جو 1838 اور 1848 کے درمیانی عرصے میں تقریباً تین پونڈ فی کوارٹر تھی، گر کر 1849 اور 1859 کے درمیانی

برسوں میں دو پونڈ دس شلنگ فی کوارٹر تک جا پہنچی ۔مطلب یہ کہ جب فارموں میں کام کرنے والوں کی اجرت کا اوسط چالیس فیصدی بڑھا ہے، اسی وقت گیہوں کی قیمت سولہ فیصدی سے بھی کچھ نیچے گر گئی ۔اب اگر ایک سرے کو دوسرے کے سامنے رکھا جائے یعنی 1849 کا 1809 مقابلہ کیا جائے تو سرکاری رجسٹروں کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ 1849 میں اگر مفلس قلاشوں کی تعداد 934419 تھی تو گھٹ کر 860470 رہ گئی، یعنی دس سال بعد 73949 مفلس کم تھے ۔مانتا ہوں کہ یہ کمی کچھ خاص قابل شمار نہیں اور بعد کے برسوں میں وہ پھر نہ ہونے کے برابر پہنچ گئی ۔تاہم کم تو ضرور ہوئی تھی ۔

کہہ سکتے ہیں کہ اناج کی قانونی پابندی (19) ہٹنے کے بعد 1849 سے 1859 کے درمیان سرحد پار سے اناج کی درآمد اتنی ہوگئی جو 1838 اور 1848 کے درمیانی عرصے کے مقابلے میں دوگنی تھی ۔تو پھر کیا ہوا؟ ویسٹن صاحب کے نقطۂ نظر سے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ سرحد پار کی منڈیوں میں اناج کی یہ زبردست اندادھند اور لگاتار بڑھتی ہوئی مانگ زراعتی پیداوار کی قیمتوں کو آسمان پر پہنچا دیتی کیونکہ بقول ان کے بڑھی ہوئی مانگ کا اثر جوں کا توں رہتا ہے چاہے یہ مانگ ملک کے اندر سے اٹھی ہو یا باہر سے ۔لیکن حقیقت میں کیا ہوا؟ اس تمام عرصے میں سوائے ان برسوں کے جب فصل بگڑ گئی، فرانس میں مستقل فریاد بلند رہی کہ اناج کے بھاؤ چوپٹ ہوئے جا رہے ہیں ۔ امریکیوں نے مجبوراً کئی بار اپنی فالتو پیداوار جلا ڈالی، اور اگر مسٹر اورکاٹ کا بیان صحیح ہے تو روس نے ہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں خانہ جنگی (20) کو ہوا دی ہے کیونکہ یورپ کی منڈیوں کیں امریکیوں کے مقابلے نے روس کی زراعتی پیداوار کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

اب اگر ویسٹن صاحب کے استدلال کو ایک عام کلیے کی شکل دی جائے تو وہ یوں ہوگی: مانگ میں ہر قسم کی بڑھوتری تبھی ہوتی ہے جب سامان یا پیداوار کی اتنی مقدار مہیا ہو۔ لہٰذا مانگ بڑھنا کسی حالت میں بھی استعمالی سامان کی سپلائی نہیں بڑھا سکتا البتہ روپے کی شکل میں اس کی قیمت بڑھا سکتا ہے۔ تاہم بڑے معمولی مشاہدے سے بھی یہ بات روشن ہے کہ بعض موقعوں پر مانگ کے بڑھنے سے مال کے بازار بھاؤ بالکل نہیں بدلتے اور بعض موقعوں پر عارضی طور سے بھاؤ چڑھ جاتے ہیں اور اس کی بدولت سپلائی بھی بڑھ جاتی ہے۔ سپلائی بڑھ جانے کی وجہ سے قیمتیں اپنے پہلے کے معیار پر اتر جاتی ہیں بلکہ بعض موقعوں پر اس سے بھی نیچے۔ یہ مانگ کا بڑھنا اجرت کا بڑھنے کے سبب ہوتا ہے یا کسی اور وجہ سے، اصل مسئلے پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ویسٹن صاحب کے نقطہ نظر سے یہ اسی قسم کا ایک عام مظہر ہے جسے سمجھانا مشکل ہے جیسے انہونے واقعات کی صورت میں یعنی اجرتوں کے بڑھ جانے کی حالت میں پیش آتا ہے۔ لہٰذا جو مسئلہ ہمارے زیر غور ہے، اس میں ویسٹن صاحب کا استدلال قطعی طور پر کچھ ثابت نہیں کرتا۔ ان کے استدلال سے صرف یہ راز کھلتا ہے کہ ایسے اصولوں اور قانونوں کا پتہ لگانا ان کے بس کی بات نہیں جن کے تحت مانگ بڑھ جانا سپلائی بڑھنے کا تقاضا کرتے ہے اور ہر گز یہ لازم نہیں آتا کہ بازار بھاؤ بھی بڑھ جائیں۔

مزدوری اور نقد رقم

بحث کے دوسرے دن ہمارے دوست ویسٹن صاحب نے اپنا پرانا عقیدہ نئے لباس میں پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ: جب اجرت بڑھتی ہے تو اس بڑھی ہوئی اجرت کو ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ نقدی ہاتھ میں ہو۔ اگر نقدی

میں کمی بیشی نہیں ہوتی تو پھر اس نہ بدلنے والی مجموعی رقم میں سے اجرت کی وہ مجموعی رقم کیسے ادا ہوگی جو پہلے سے بڑھ چکی ہے؟ پہلے یہ مشکل درپیش تھی کہ مزدور کے حصے میں خریداری کے لئے جو سامان آتا ہے وہ اتنے کا اتنا ہی رہا حالانکہ نقد اجرت بڑھ گئی۔ اب دوسری دشواری کا سامنا ہے کہ مزدور کی نقد اجرت تو بڑھ گئی لیکن سامان کی مقدار نہیں بڑھنے پاتی۔ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ ویسٹن صاحب کے خیال کی بنیادی اینٹ کھسکا دیں تو اوپر کی دوسری الجھنیں خود بخود نکل جائیں گی۔

پھر بھی میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ نقد رقم کے بارے میں جو سوال ہے اسے زیر بحث مسئلے سے دور دور کوئی واسطہ نہیں۔

آپ کے ملک میں روپے کے لین دین کی چول اس کمال کے ساتھ بٹھائی گئی ہے کہ یورپ کے کسی ملک میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بینکوں کا سسٹم اس خوبی کے ساتھ پھیلا ہونے اور سب کڑیاں جڑی ہونے کی بدولت یہ سہولت حاصل ہے کہ جتنی مالیت کو گردش میں رکھنا ہے، یا جتنی رقم کا کاروبار جاری رکھنا ہے، اتنی یا اس سے زیادہ رقم کا کاروبار چلانے کے لئے کہیں کم نقدی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال لیجئے، اجرت کا معاملہ یوں ہے: انگلستان میں کارخانے کا مزدور ہر ہفتے جو اجرت پاتا ہے وہ لاکر دوکاندار کے حوالے کرتا ہے، دوکاندار ہر ہفتے یہ رقم بینکر کو بھیج دیتا ہے، وہ ہر ہفتے کارخانہ دار کو لوٹا دیتا ہے جو پھر اپنے مزدوروں کو ادا کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس مشینی عمل کا کرشمہ ہے کہ مزدور کی سال بھر کی اجرت، فرض کیجئے اگر باون پونڈ ہو، تو وہ محض ایک اشرفی (گنی) کے گھماؤ سے ادا ہو سکتی ہے کیونکہ یہی ایک پونڈ ہر ہفتے گھوم گھوم کر باون ہفتے پورے کر لے گا۔ انگلستان میں بھی یہ مشینی عمل اتنا پختہ نہیں جتنا سکاٹ لینڈ میں۔ اور پھر یہاں بھی ہر جگہ اس کی کارکردگی

یکساں مکمل نہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً جن حلقوں میں صرف کارخانے ہیں، ان کے مقابلے میں بعض دیہاتی حلقوں کے اندر کہیں کم مجموعی مالیت کو گردش میں رکھنے کے لئے کہیں زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔

اگر آپ چینل پار کر کے یورپ کی طرف جائیں تو دیکھیں گے بلکہ وہاں نقد اجرتیں انگلستان کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ پھر بھی جرمنی، اٹلی، سوئزرلینڈ اور فرانس میں ان اجرتوں کی ادائیگی کے لئے کہیں زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہاں نہ تو ہر اشرفی اتنی تیزی سے بینکر کے ہاتھ میں پہنچتی ہے اور نہ اس تیز رفتاری سے گھوم پھر کر سرمایہ دار کے پاس آجاتی ہے۔ اس لئے بجائے ایک اشرفی کے جو سال بھر کا چکر کاٹ کر باون پونڈ کا کام کر دیتی ہے، یورپ کے براعظم میں ممکن ہے تین اشرفیوں کی ضرورت پڑے تاکہ سال بھر تک نقد اجرت کی صورت میں پچیس پونڈ ادا کئے جائیں۔ اس طرح انگلستان سے یورپ کے ملکوں کا موازنہ کرتے ہوئے آپ فوراً یہ بات نکال سکتے ہیں کہ کم تر اجرتوں کے لئے اس سے زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑ سکتی ہے جتنی زیادہ اجرتیں دینے کے لئے پڑتی ہے۔ اور حقیقت میں یہ سوال محض ٹیکنیکل ہے جس کا ہمارے موضوع سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے بزیادہ سے زیادہ صحیح شمار کے حساب سے انگلستان کے مزدور طبقے کی سالانہ اجرت کا اندازہ 20 کروڑ پونڈ بیٹھتا ہے۔ یہ زبردست رقم قریب قریب تیس لاکھ پونڈ نقدی کی مدد سے ادا کی جاتی ہے۔ فرض کیجئے اجرتیں پچاس فیصدی بڑھا دی جاتی ہیں تو جہاں تیس لاکھ پونڈ کی رقم لگتی ہے وہاں پنتالیس لاکھ پونڈ کی ضرورت پڑے گی۔ اب چونکہ مزدور اپنے روزمرہ کے خرچ کا زیادہ تر حصہ چاندی اور تانبے کے سکوں میں ادا کرتا ہے، یعنی ان معمولی سکوں میں جن کی

قدر و قیمت سونے کی نسبت اسی طرح قانون کے حکم سے مقرر ہوتی ہے تو اجرتوں کے پچاس فیصدی بڑھائے جانے میں حد سے حد یہی ہونے والا ہے کہ جتنی اشرفیوں کی کمی پڑتی وہ اور گردش میں شامل کر دی جائیں، یہ رقم یوں کہئے کہ دس لاکھ اشرفی ہوگی۔ فرق یہی ہوا کہ دس لاکھ اشرفی جو فی الحال سونے کی سلاخوں کی یا سکوں کی صورت میں بینک آف انگلینڈ کے یا پرائیویٹ بینکروں کے تہہ خانوں میں پڑی ہے، وہ چلنے لگے گی۔ اس دس لاکھ اشرفی کا سکہ ڈھالنے میں یا سکہ گھسنے پٹنے میں جو برائے نام خرچ ہوتا ہے اس خرچ کی بھی کفایت کی جا سکتی ہے اور ایسی حالتوں میں جب سکے کی گردش بڑھنے کے سبب سے کہیں رکاوٹ پڑتی ہے تو یہ کفائت کر لی جاتی ہے۔ آپ کو علم ہے کہ انگلستان میں جو زر گردش میں رہتا ہے، اس کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم میں تو وہ زر آ جاتا ہے جس میں ہر طرح کے بینک نوٹ شامل ہیں جو تجارت پیشہ لوگوں کے درمیاں چلتے ہیں اور ذرا بڑی بڑی ادائیگیوں کے لئے استعمال کرنے والوں اور تاجروں کے درمیان ہاتھ بدلتے رہتے ہیں دوسری قسم کا زر وہ ہے جس میں دھات کے سکے ہیں اور چھوٹے لین دین میں چلتے ہیں۔ اگر چہ گردش میں رہنے والے زر کی یہ دونوں قسمیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تاہم ایک دوسرے پر سے پھلانگی رہتی ہیں۔ سونے کے سکے کا عام چلن ہے اور جہاں پانچ پونڈ سے کم کسی طاق رقم کی ذرا بڑی ادائیگی کرنی ہے وہاں بھی اسی سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر کل کو چار، تین یا دو پونڈ کے بینک نوٹ جاری کر دئے جائیں تو سونے کے یہ سکے جو پانچ پونڈ سے نیچے کی ادائیگی میں جا بجا چل رہیں، فوراً یہ جگہیں چھوڑ دیں گے اور اس طرف کا رخ کریں گے جہاں نقد اجرتیں بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی ضرورت محسوس ہونے والی ہے۔ اس طرح سے پچاس فیصدی اجرت

بڑھنے کے نتیجے میں جو مزید دس لاکھ اشرفی درکار ہے وہ ایک اشرفی بڑھائے یا بنائے بغیر ہی دستیاب ہو جاتی ہے۔ یہی نتیجہ بینک نوٹ کی گنتی بڑھائے بغیر حاصل کیا جا سکتا ہے، صرف زیادہ سرکاری بونڈ گردش میں لانا ہوں گے جیسا کہ لنکا شائر میں کافی زمانے تک ہوتا رہا۔

اگر اجرتوں کے میعار کا عام طور سے بلند ہونا، مثلاً سو فیصدی بلند ہونا، جیسا کہ ویسٹن صاحب نے فارموں پر کام کرنے والوں کے سلسلے میں سوچا ہے، مقدم ضروریات زندگی کی چیزوں کی قیمتیں کافی بڑھا دیتا ہے اور، ویسٹن صاحب کے نظریے کے مطابق، اوپر سے اور نقد رقم طلب کرتا ہے جو حاصل نہیں کی جا سکتی تو اجرتوں کے عام طور سے گرنے کا اثر بھی ایسا ہی اور اسی حد تک ہونا چاہئے، لیکن اس کے بالکل الٹ۔ لاجواب بات! آپ سب واقف ہیں کہ 1808 سے 1860 کا زمانہ سوتی کپڑا ملوں کی صنعت پھلنے پھولنے کا زمانہ تھا، خاص طور سے 1860 تو ایسا سال گذرا ہے کہ تجارت کی پرانی یادداشتوں میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر یہی وہ زمانہ ہے جب صنعت کی دوسری شاخوں نے بھی پہلے سے کہیں زیادہ فروغ پایا۔ سوتی ملوں کے مزدوروں کی اجرت اور اسی سے دوسری صنعتی شاخوں میں اجرت کا معیار اتنا بڑھا ہوا تھا جو پہلے کبھی نہیں پہنچا۔ اتنے میں امریکی بحران آیا اور ان تمام مزدوروں کی اجرتیں ایکا ایکی ایسی گریں کہ پہلے کے مقابلے میں تقریباً چوتھائی رہ گئیں۔ اس کے برخلاف ہوتا تو یہ تین سو فیصدی بڑھنا کہلاتا کیوں کہ اگر اجرت پانچ سے بیس ہو جائے تو ہم اسے تین سو فیصدی بڑھنا کہتے ہیں۔ اور اگر وہ بیس سے پانچ رہ جائے تو ہم کہیں گے کہ پچھتر فیصدی گھٹ گئی۔ ایک واقعے میں اس کا بڑھنا، دوسرے میں اس کا گھٹنا دونوں کی رقم ایک ہی ہے یعنی

پندرہ شلنگ اجرت کے معیار میں۔ اس وقت یہ ایسی اچانک انجانی تبدیلی آئی تھی اور پھر مزدوروں کی اتنی وسیع تعداد کو اس نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا کہ اگر ان سب مزدوروں کو شمار کیا جائے، ان کو بھی جو براہ راست سوتی ملوں میں لگے ہوئے تھے، اور ان کو بھی جو اس صنعت کے سہارے بسر کرتے تھے تو یہ تعداد زراعی فارموں میں کام کرنے والوں سے ڈیڑھ گنی ہوتی ہے۔ تو کیا گیہوں کی قیمت گر گئی؟ نہیں، بلکہ 1858 سے 1860 کے تین برسوں میں قیمت کا سالانہ اوسط 47 شلنگ 8 پینس فی کوارٹر رہا تھا تو 1861۔1863 کے تین برسوں میں قیمت کا اوسط بڑھ کر 55 شلنگ 10 پینس فی کوارٹر ہو گیا اور جہاں تک سکے کا تعلق ہے تو ٹکسال میں صرف 1861 میں 8673232 پونڈ بنا کر نکالے گئے، حالانکہ 1860 کے یہ مقدار 3378102 پونڈ تھی۔ دوسرے لفظوں میں 1861 کے دوران 5295130 پونڈ کا سکہ زیادہ ڈھالا گیا۔ صحیح ہے کہ 1861 میں جتنے بینک نوٹ چل رہے تھے ان کی تعداد 1860 کے مقابلے میں 1319000 پونڈ کم تھی۔ اس پوری رقم کو منہا کر دیں، تب بھی بہر حال 1861 میں جو زر گردش میں تھا وہ 1860 کے خوشحالی والے سال کے مقابلے میں 3976130 یا تقریباً چالیس لاکھ پونڈ زیادہ ہی تھا رہا سونے کا محفوظ ذخیرہ تو بینک آف انگلینڈ کے پاس وہ اس عرصے میں گھٹ گیا۔ اگرچہ اس میں اتنا گھاٹا نہیں آیا، تاہم اس کے قریب قریب کمی پڑی۔

1862 کا 1842 سے مقابلہ کر کے دیکھیں۔ علاوہ اس کے کہ جو مال گردش میں تھا اس کی مالیت اور مقدار بھی بڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچی، لیکن اگر صرف سرمائے کو لیجئے تو انگلینڈ اور ویلز میں ریلوے کے بونڈ پر لگے ہوئے حصوں، قرضوں

اور دستاویزی رقموں وغیرہ کا سرمایہ بڑھتے بڑھتے 1862 میں 32 کروڑ پونڈ کو پہنچ گیا اور یہ وہ رقم تھی جو 1842 میں فرضی داستان معلوم ہوتی۔ پھر بھی زر کی عام مقدار جو 1842 اور 1862 میں گردش میں تھی وہ قریب قریب اتنی ہی تھی۔ و یسے بھی گردش کرتے ہوئے زر نقد کو رفتہ رفتہ کم کرنے کا رجحان دکھائی دیتا ہے، حا لانکہ مال کی جملہ مالیت بھی بے انتہا بڑھ گئی ہے اور مالیاتی لین دین کا پھیلاؤ بھی زبر دست ہو گیا ہے۔ ہمارے دوست ویسٹن کے نقطہ نظر سے یہ ایک بن بوجھی پہیلی ہے۔

وہ ذرا نظر سے اور گہرائی میں اترتے تو انہیں پتہ چلتا کہ اگر اجرت کو بالکل ایک طرف رکھ دیں اور فرض کر لیں کہ اجرتوں میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی تب بھی جو مالیت اور مال کی کثیر مقدار گردش میں ہے۔ مالیاتی لین دین میں جو زبردست سود ے ہوتے ہیں، ان کی مجموعی رقم، یہ سب عموماً ہر روز بدلتا رہتا ہے؛ اور یہ کہ جو بینک نوٹ جاری کیے جاتے ہیں ان کی مقدار روزانہ بدلتی ہے؛ اور یہ کہ ان ادائیگیو ں کی مقدار روزانہ بدلتی رہتی ہے جو نقد رقم کے بغیر وصول ہوتی ہیں اور بونڈ، قرضو ں، چیکوں، بک کریڈٹوں، کلیرنگ ہاؤسوں کے واسطے سے کی جاتی ہیں؛ اور یہ کہ جہاں تک دھات کے چلتے ہوئے سکوں کی ضرورت ہے تو سکوں کی اس مقدار کا تناسب جو گردش میں رہتا ہے، سکوں اور سلاخوں کی اس مقدار سے جو محفوظ ذخیر ے یا بینک کے تہہ خانوں میں پڑی ہو، روزانہ بدلتا رہتا ہے؛ اور یہ کہ سونے کی وہ مقدار جو قوم کے ہاتھوں میں گھومتی رہتی ہے اور وہ مقدار جو سرحد پار بھیجی جاتی ہے تا کہ اسے بین الاقوامی گردش دی جائے، دونوں میں روزانہ فرق پڑتا رہتا ہے؛ ا نہیں پتہ چل جاتا کہ مجموعی رقم کے اٹل ہونے کا جو اٹل عقیدہ انہوں نے تراشا ہے،

وہ ایک ہولناک گمراہی ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی سے کہیں میل نہیں کھاتی۔ بجائے اس کے کہ وہ کرنسی کے قانونوں سے اپنی بے خبری کو ایک دلیل بنا کر اجرت بڑھائے جانے کے خلاف استعمال کریں، ویسٹن صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ ان قوانین کا مطالعہ کریں جو کرنسی میں یہ لوچ پیدا کرتے ہیں کہ وہ اتنے لگاتار بدلتے ہوئے حالات کے مقابلے میں خود کو ڈھالتی چلی جاتی ہے۔

4۔ سپلائی اور مانگ Supply and Demand

ہمارے دوست ویسٹن صاحب اس لاطینی کہاوت کو مانتے ہیں کہ:

repetitio est mater studirum یعنی دہرانا علم حاصل کرنے کی ماں ہے اسی لئے انہوں نے اپنے شروع کے اٹل عقیدے کو نئی شکل میں پھر سے دہرا دیا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ اجرتوں کے بڑھنے کی وجہ سے جو کرنسی کی کمی پڑے گی وہ اپنی لپیٹ میں سرمائے کی کمی وغیرہ لے کر آئے گی۔ چونکہ میں زر کے بارے میں ان کی خیال آرائی کے متعلق پہلے ہی کہہ چکا ہوں اس لئے اب ان فرضی نتیجوں پر تفصیل سے بحث کرنا بالکل فضول ہوگا جو ویسٹن صاحب کے خیال میں کرنسی کے اس بھونچال سے ظاہر ہونے والے ہیں جو خود انہوں نے فرض کر رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں ان کے اس اٹل عقیدے کو طرح طرح سے دہرائے جانے کے باوجود جوں کا توں یعنی دوٹوک طریقے سے نظریاتی شکل میں کھول کر رکھ دوں۔

انھوں نے اپنے موضوع کے ساتھ کس قدر بے احتسابی برتی ہے، یہ صرف ایک ریمارک سے روشن ہو جائے گا۔ انہیں اجرتوں کے بڑھائے جانے پر اعتراض ہے۔ میں ان سے سوال کرتا ہوں، یہ بتائیے، اونچی اجرت اور نیچی اجرت کیا ہوتی ہے؟ مثلاً ایسا کیوں ہے کہ پانچ شلنگ فی ہفتہ تو نیچی اجرت ٹھہری اور بیس شلنگ فی

ہفتہ اونچی اجرت؟ اگر پانچ شلنگ بیس شلنگ کے مقابلے میں کم اجرت ہے جو بیس شلنگ دوسو شلنگ فی ہفتہ کے سامنے اور بھی کم اجرت ہوئی۔ اگر کئی شخص تھرمامیٹر پر لکچر دیتے ہوئے صرف یہی کہتا رہے کہ پارہ اتنا اونچا چڑھ گیا، اتنا نیچے گر گیا تو اس سے کسی کو کچھ معلومات نہیں ملنے والی۔ سب سے پہلے اسے یہ بتانا چاہئے کہ اتنے ڈگری پر پانی جم جاتا ہے، اتنے پر ابلنے لگتا ہے، اور فطرت کے قانون نے یہ حدیں مقرر کر رکھی ہیں، یہ ان لوگوں کا ڈھکوسلا نہیں ہے جو تھرمامیٹر بیچتے یا بناتے ہیں۔ ویسٹن صاحب نے اجرت اور منافع کے بیان میں یہ کہیں نہیں بتایا کہ معاشی قانون سے ابتدا اور انتہا کے یہ نقطے قرار پاتے ہیں، بتایا کہ معاشی قانون سے ابتدا اور انتہا کے یہ نقطے قرار پاتے ہیں، بتانا تو کیا، انھوں نے ان نقطوں کی تلاش کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی وہ اتنے میں ہی مطمئن ہو گئے کہ اونچے اور نیچے کے جو چلتے ہوئے بے حیثیت لفظ تھے انھی کو قبول کر لیا اور سمجھ لیا کہ بس ان میں ایک مقررہ اور قطعی مفہوم پوشیدہ ہے، اگرچہ یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ کسی ایک پیمانے سے ناپنے کے بعد، جس کے ذریعے کمی بیشی کا اندازہ کیا جائے اجرت کو چاہے اونچا کر لیجئے، چاہے نیچا۔

وہ مجھے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ محنت کی ایک مقررہ مقدار کے بدلے میں ایک مقررہ رقم کیوں دی جاتی ہے۔ اگر وہ جواب دیں کہ سپلائی (رسد) اور ڈیمانڈ (طلب یا مانگ) کے قانون سے یہ رقم طے پاتی ہے تو میں فوراً سوال کروں گا کہ پھر وہ کون سا قانون ہے جس کے ذریعے سپلائی اور ڈیمانڈ میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے؟ اسی انداز کا جواب انھیں بند گلی میں پہنچا دے گا۔ محنت کی سپلائی اور اس کی مانگ کے درمیان مستقل کمی پیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس کمی بیشی کے ساتھ ساتھ محنت

کا بازار بھاؤ بھی بدلتا رہتا ہے۔ اگر مانگ سپلائی سے بڑھ گئی تو اجرت بڑھ جاتی ہے اور اگر سپلائی مانگ سے اوپر گئی تو اجرت گر جاتی ہے، اگر چہ اس قسم کے حالات پیدا ہونے پر یہ ٹٹول کر دیکھنا بھی ضروری سمجھا جا سکتا ہے کہ واقعی سپلائی اور ڈیمانڈ کس رنگ میں ہیں مثلاً ہڑتال کے ذریعے یا کسی اور تدبیر سے یہ جانچ کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ سپلائی اور ڈیمانڈ کا قانون ہی اجرتوں کو ایک نہج پر رکھنے والا قانون ہے تو پھر اجرت بڑھنے کے خلاف آپ کا دعویٰ بچگانہ بھی ہے اور فضول بھی، کیوں کہ اس حاوی مطلق قانون کے مطابق جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں، وقت وقت سے اجرت کا بڑھنا بھی اتنا ہی لازمی اور قاعدے کی بات ہے جتنا وقتاً فوقتاً اجرت کا گرنا۔ لیکن اگر آپ سپلائی اور ڈیمانڈ کو اجرتوں کی باقاعدگی رکھنے والا قانون نہیں مانتے تو میں اپنا سوال پھر سے دہراتا ہوں: ایسا کیوں ہے کہ محنت کی ایک مقررہ مقدار کے بدلے ایک مقررہ رقم ادا کی جاتی ہے؟

مگر اس معاملے کو ذرا زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ دیکھیں: اگر آپ یہ تصور کر لیں کہ محنت کی قدر (ویلیو) یا کسی اور مال کی قدر بالآخر سپلائی اور مانگ سے ہی طے پاتی ہے تو آپ سراسر غلطی پر ہیں۔ سپلائی اور مانگ تو بازاری بھاؤ کی صرف وقتی اونچ نیچ کو چلاتی ہیں۔ ان کے ذریعے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی مال کا بازار بھاؤ اس کی ویلیو سے اوپر کیوں جا رہا ہے یا اس سے نیچے کیوں اتر رہا ہے، لیکن سپلائی اور مانگ سے خود کسی مال کی ویلیو (قدر) کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ فرض کئے لیتے ہیں کہ سپلائی اور ڈیمانڈ آپس میں ایک دوسرے کا پلہ برابر رکھتے ہیں یا ماہرین معاشیات کے بقول وہ ایک دوسرے کو پورا کرتے ہیں۔ ٹھیک اس وقت جب یہ دونوں آمنے سامنے کی طاقتیں ایک دوسرے کے برابر تلتی ہیں، تو وہ ایک دوسرے کو ناکارہ کر دیتی

ہیں اور کسی سمت میں بھی حرکت نہیں ہونے دیتیں۔ جب سپلائی اور ڈیمانڈ ہم پلہ ہو جائیں اور اس کے باعث اثر تاثیر چھوڑ دیں تو مال کے بازار بھاؤ اس کی اصل ویلیو (قدر) یا معمول کی قیمت سے میل کھاتے ہیں اور اسی کے آس پاس چکر لگارہے رہتے ہیں۔ لہٰذا جب اس ویلیو کی نوعیت کا پتہ لگانے نکلیں تو ہمیں اس سے کوئی غرض نہ ہونی چاہئے کہ سپلائی اور ڈیمانڈ کا بازار بھاؤ پر وقتی اثر کیا پڑتا ہے۔ یہ بات اجرت کے بارے میں بھی اتنی ہی درست ہے جتنی اور تمام قسموں کے مال کی قیمتوں پر صادق آتی ہے۔

ہمارے دوست کی تمام دلیلیں اگر ان کو نہایت سادہ نظریاتی لفظوں میں سمویا جائے تو لے دے کر اس ایک اذعانی عقیدے کے کلمے پر پہنچتی ہیں: "مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں یا ان کے مطابق چڑھتی اترتی ہیں"۔

اس دقیانوسی اور ٹھکرائی ہوئی غلط بیانی کا توڑ کرنے کے لیے میں عملی تجربے کی مدد بھی لے سکتا ہوں اور یہ بھی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہ حقیقت جتادوں کہ انگریزی کا رخانوں کے مزدور، کان کھودنے والے، جہاز بنانے والے مزدور وغیرہ یعنی وہ جن کی محنت کے اچھے دام اٹھتے ہیں، ان کے ہاتھوں جو سامان تیار ہو کر نکلتا ہے، وہ دوسری قوموں کے تیار کیے ہوئے ویسے ہی سامان کے مقابلے میں کچھ سستا بکتا ہے، حالانکہ اس کے سامنے انگریزی فارموں میں کام کرنے والوں کی محنت سے جو سامان تیار ہوتا ہے۔ اور یہ وہ ہیں جن کی محنت کم داموں پر جاتی ہے۔ وہ سامان قریب قریب تمام دوسری قوموں کے اسی سامان سے زیادہ مہنگا بکتا ہے۔ میں کسی ایک ملک کی بنی ہوئی کئی چیزوں کا مقابلہ کر کے یا کئی ملکوں کے مال کا موازنہ کر کے یہ دکھا سکتا ہوں کہ چند موقعوں کو چھوڑ کر جن میں اصلیت کے بجائے دکھاوا زیادہ

ہے، باقی اوسط موقع ایسے ہیں کہ زیادہ دام پانے والی محنت سستا مال تیار کرتی ہے اور کم دام پانے والی مہنگا مال۔ اس سے دور دور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک موقع پر محنت کی اونچی قیمت اور دوسرے موقع پر نیچی قیمت ہر بار ایک دوسرے کے بالکل الٹا نتیجہ پیدا کرتی ہیں، لیکن بہر حال ان سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ محنت کے داموں سے مال کی قیمتیں نہیں چکائی جاتیں۔ تاہم تجربے سے بات پیدا کرنے کا یہ طریقہ ہمارے لیے بالکل غیر ضروری ہے۔

ممکن ہے کسی کو اس سے انکار ہو کہ مسٹر ویسٹن نے اس عقیدے پر زور دیا ہے کہ "مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں یا ان کے مطابق چڑھتی اترتی ہیں"۔ واقعی انہوں نے خود یہ فارمولا پیش نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کا کہنا ہے کہ منافع اور کرایہ بھی مال کی قیمتوں میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ مال کی قیمتوں سے ہی، محنت کرنے والوں کی اجرت کے علاوہ سرمایہ دار کا منافع اور زمین جائیداد والے کا کرایہ نکالا جاتا ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ مسٹر ویسٹن کی رائے میں قیمتوں کا تعین کیسے ہوتا ہے؟ اول تو اجرتوں سے ہوتا ہے۔ پھر کچھ فیصدی سرمایہ دار کے منافع کے طور پر اور کچھ فیصدی زمین والے کا کرایہ ان قیمتوں میں جوڑ لیا جاتا ہے۔ فرض کیجیے کسی مال کی تیاری میں جو لیبر لگی ہے، اس کی اجرت دس کے برابر ہوئی ہے، منافع کی شرح اگر اجرت کے ہم پلہ سو فیصدی رکھی جائے تو سرمایہ دار مال کی قیمت میں دس اور بڑھا دے گا اور اسی نسبت سے اگر کرایہ زمین وغیرہ اجرت کا سو فیصدی ہو تو دس اور بڑھایا جائے گا، یعنی مال کی قیمت تیس ہو گئی۔ قیمتوں کا یہ جو تعین ہوا یہ سیدھا سیدھا اجرتوں کے حساب سے قرار پایا ہے۔ اگر اوپر کی مثال میں اجرت دس کے بجائے بیس کو پہنچ جائے تو مال کی قیمت بھی تیس سے ساٹھ ہو جائے گی۔

یہی نسبت آگے چلے گی۔ چنانچہ سیاسی معاشیات پر اگلے وقتوں کے جتنے لکھنے وا لے گزرے ہیں، جنہوں نے یہ اندھا اعتقاد پھیلایا کہ اجرتیں ہی قیمتوں کی کمی پیشی طے کرتی ہیں، وہ ثبوت میں ہمیشہ یہی کوشش کرتے رہے کہ منافع اور کرائے کو اجرتوں پر فیصدی اضافہ سمجھ کر جوڑ دیا جائے۔ لیکن ان میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ اس فیصدی اضافے کی حدود کو کسی معاشی قانون یا اصول کا پابند کر کے دکھائیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہوں نے دل میں سوچ رکھا ہے کہ منافع کا سوال پرانے دستور یا چلن سے، سرمایہ دار کی مرضی سے یا کسی ایسے ہی یک طرفہ اور انجانے طریقے سے طے پاتا ہے۔ اگر وہ اس پر زور دیں کہ منافعے طے پاتے ہیں سرمایہ داروں کے درمیان مقابلے سے تو یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ مقابلہ ہو گا تو مختلف کاروباروں میں منافع کی اونچ نیچ اپنا پلہ برابر کرلے گی یعنی منافع کی مختلف شرحوں کو کسی اوسط پر لے آئے گی، لیکن وہ لیول کیا ہونا چاہیے، یا منافع کی عام شرح کتنی ہو، یہ کبھی طے نہ کر سکے گی۔

جب ہم کہتے ہیں کہ مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں تو ہم کہنا کیا چاہتے ہیں؟ خود اجرت کیا ہے؟ محنت کی قیمت۔ تو مطلب یہ ہوا کہ مال کی قیمتیں محنت کی قیمت سے طے پاتی ہیں مگر چونکہ "قیمت" تبادلہ ہے (جب بھی میں قدر (و یلیو) کا نام لیتا ہوں، میرا مطلب ہوتا ہے اس ویلیو سے جس پر مالوں کا تبادلہ کیا جا ئے) تو قیمت وہ ویلیو ہوئی جو نقدی کی صورت میں ظاہر ہو۔ بیان کا خلاصہ یہ نکلا کہ ''مالوں کی قدر (ویلیو) محنت کی ویلیو سے طے پاتی ہے،، یا یوں کہیں کہ'' محنت کی و یلیو ہی ایک عام پیمانہ ہے جس سے اور قدریں ناپی جاتی ہیں"۔

تو پھر خود'' محنت کی ویلیو، کیوں کر طے پاتی ہے؟ آگے راستہ بند ہے۔

اگر ہم منطق کی معقولیت سے بحث کریں تو واقعی راستہ بند ہے۔ لیکن جو لوگ اوپر کے عقیدے کے قائل ہیں انہیں منطقی معقولیت سے کیا سروکار۔ ہمارے دوست ویسٹن صاحب کی مثال لیجئے۔ پہلے تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں، لہٰذا اجرت بڑھنے سے قیمت بھی ضرور بڑھے گی۔ پھر انہوں نے ایک چکر اور کاٹا اور ہمیں جتایا کہ اجرتوں کے بڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ سامان کی قیمتیں بھی بڑھ چکی ہوں گی اور حقیقت میں اجرتوں کا ناپ ہے اس سامان کی قیمتوں سے جس پر یہ اجرتیں خرچ کی جاتی ہیں۔ تو اب ہم یہ کہتے کہتے کہ محنت کی ویلیو مالوں (یا سامان) کی ویلیو کا فیصلہ کرتی ہے، یہ کہنے پر اتر آتے ہیں کہ مالوں کی ویلیو محنت کی ویلیو کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس طرح ہم آگے پیچھے چکر کاٹتے رہ جاتے ہیں اور نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔

لے دے کے ظاہر یہ ہوا کہ اگر ہم کسی ایک مال کی ویلیو کو چاہے وہ محنت کی ویلیو ہو، اناج کی ہو یا کسی اور مال کی، باقی تمام قدروں کا ناپ اور انہیں چلانے والا مان لیتے ہیں تو ہم مشکل کا بوجھ صرف ٹال رہے ہیں کیونکہ ایک ویلیو جو خود اپنا تعین چاہتی ہے، ہم اس کا تعین دوسری ویلیو سے کیے دے رہے ہیں۔ یہ اندھا اعتقاد کہ "اجرتیں ہی مالوں کی قیمتیں طے کرتی ہیں" اگر مطلق طریقے سے رکھ دیا جائے تو اس نوبت کو پہنچا دیتا ہے کہ "ویلیو طے پاتی ہے ویلیو سے" اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ویلیو کے بارے میں دراصل کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ اگر اس قیاس کو بنیاد مان لیا جائے تو سیاسی معاشیات کے عام اصولوں کے بارے میں سارا بحث استدلال تو تلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ماہر معاشیات ریکارڈو کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی 1817 میں شائع شدہ تصنیف "سیاسی معاشیات کے اصول"

میں اس پرانے، بوسیدہ، مقبول عام مفروضے کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا کہ " اجرتیں ہی قیمتوں کا فیصلہ کرتی ہیں"۔ یہ ایک ایسا مفروضہ تھا جسے آدم اسمتھ اور اس کے فرانسیسی پیشرو اپنی معاشی تحقیقات کے اصل علمی حصوں میں تو رد کر چکے تھے لیکن پھر بھی انہوں نے ہلکے پھلکے اور گھٹیا قسم کے بابوں میں اسی کو پھر دہرا دیا تھا۔

قدر اور محنت Value and Labour

صاحبان اب میں اس نکتے پر آ گیا ہوں جہاں سوال زیر بحث کو قطعی طور پر صاف کرنا ضروری ہے۔ میں یہ وعدہ نہیں کرتا کہ آپ کی پوری تسلی کر سکوں گا کیونکہ اس کے لئے تو سیاسی معاشیات کا پورا میدان چھاننا پڑے گا۔ البتہ اتنا ہے کہ بقول فرانسیسیوں کے effleurer la question یعنی بنیادی نکتوں کو چھوتا ہوا گذروں گا۔

پہلا سوال ہمیں یہ اٹھان ہوگا: کسی مال کی ویلیو (قدر) کیا ہوتی ہے؟ اور کیسے طے پاتی ہے؟

پہلی نظر میں پتہ چل جاتا ہے کہ کسی مال کی ویلیو ایک اضافی یا نسبتی چیز ہے اور وہ طے نہیں پاتی جب تک کہ ایک مال کو دوسرے مالوں کی نسبت سے نہ تولا جائے۔ حقیقت میں جب ہم ویلیو کا لفظ زبان سے نکالتے ہیں، یعنی مال کے بدلے میں جو ویلیو ملتی ہے، وہ کہتے وقت ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تبادلے میں جو دوسرے مال ملیں گے ان کی مقداروں کی نسبت اتنی ہوگی۔ تب سوال یہ ہوگا کہ جن نسبتوں میں مالوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ ہوتا ہے وہ نسبتیں کم و بیش کیوں کر ہوتی رہتی ہیں۔

تجربے نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ یہ نسبتیں برابر ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ صرف کسی

ایک مال کو لے لیجئے۔ مثال کے طور پر گیہوں کی ایک بوری کو دوسرے مختلف مالوں کے بے شمار تناسب سے بدلا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اس کی ویلیو جوں کی توں رہتی ہے، چاہے ہم اسے ریشم سے بدلیں، سونے سے یا کسی اور مال سے، مگر وہ جو ویلیو ہے وہ مختلف چیزوں کے ساتھ تبادلے کی شرح بدلتے رہنے کے باوجود الگ اپنا کوئی وجود رکھتی ہے۔ مختلف مالوں سے تبادلے میں جو طرح طرح کی نسبتیں بنتی ہیں ان سے ہٹ کر بھی کسی الگ صورت میں ویلیو کو ظاہر کرنے کا امکان تلاش کرنا چاہئے۔

آگے چلئے: اگر میں کہوں کہ گیہوں کی ایک بوری لوہے کی ایک خاص مقدار سے بدلی جاتی ہے یا گیہوں کی ایک بوری کے ویلیو لوہے کی اتنی مقدار میں ظاہر ہوتی ہے یا گیہوں کی ایک بوری کی ویلیو لوہے کی اتنی مقدا میں ظاہر ہوتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ گیہوں کی ویلیو اور اس کے مساوی لوہے کی ویلیو برابر ہیں کسی تیسری چیز کے، جو نہ گیہوں ہے نہ لوہا، کیونکہ میرے ذہن میں ان دونوں کی ایک خاص مقدار دو مختلف صورتوں میں آئی ہے۔ چنانچہ گیہوں یا لوہا، لدونوں میں سے کوئی بھی مال ایک دوسرے سے قطعی بے تعلق رہ کر اس تیسری چیز کے مساوی ہوگا جس میں ان دونوں کا مشترکہ ناپ موجود ہے۔

اسی نکتے کو اور واضح کرنے کے لئے میں سیدھی اقلیدسی شکل لیتا ہوں۔ مثلثوں کی جتنی بھی شکلیں بن سکتی ہیں اور جتنے بھی چھوٹے بڑے مثلث بنائے جا سکتے ہیں ان کے رقبے کا موازنہ کرنے میں، یا مثلثوں کا مستطیل کے رقبے سے یا زاویہ قائمہ کی کسی اور شکل کے رقبے سے موازنہ کرنے میں ہمیں کیا کرنا ہوتا ہے؟ ہم کسی بھی مثلث کو لے کر اس کا رقبہ ایسی صورت میں نکال لیتے ہیں جو اس مثلث کی ظاہر شکل سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ خود مثلث کی بناوٹ سی ہی ہم نے یہ اصول

بنالیا ہے کہ بنیاد کو بلندی سے ضرب دے کر جو حاصل ضرب ہوگا، مثلث کا پورا رقبہ اس سے آدھا ہوگا۔ اب ہم اس رقبے کو ہر قسم کے مثلثوں اور طرح طرح کی شکلوں کے مستطیلوں کے مختلف رقبوں سے ملا کر دیکھ سکتے ہیں کیونکہ ان کے جتنے بھی رقبے نکلیں گے وہ سب مثلثوں کی کسی نہ کسی تعداد کے رقبے کے برابر ہی پہنچیں گے۔

مختلف مالوں کی ویلیو نکالنے میں بھی حساب کا یہی قاعدہ اپنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں ان سب کی قدروں کو کسی ایسی صورت میں ڈھالنا چاہیے جو سب میں مشترک ہو البتہ وہ خاص ناپ ان مالوں میں جتنا کم یا زیادہ ہو اسی نسبت سے وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانے جائیں۔

چونکہ مالوں کے اندر مبادلے کی قدریں صرف ان چیزوں کی سماجی کارگزاری میں ہی ہوتی ہیں اور ان چیزوں کی قدرتی خاصیتوں سے ویلیو کو کچھ واسطہ نہیں ہوتا اس لیے ہمارا پہلا سوال یہ ہوگا کہ مالوں کے اندر وہ کون سا سماجی جوہر ہے جو سب میں مشترک ہو؟ وہ ہے لیبر (محنت)۔ کسی مال کو تیار کرنے میں محنت کی خاصی مقدار یا تو اس پر لگانی پڑتی ہے یا اس میں کھپی ہوتی ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ محض محنت کی نہیں بلکہ سماجی محنت کی خاص مقدار۔ جب کوئی شخص ایک چیز فوری ضرورت کے لیے، ذاتی استعمال کے لیے تیار کرتا ہے تو وہ ایک تیار چیز ہوئی، تیار مال نہیں ہوا۔ اس شخص نے اپنا کام چلانے کو ایک چیز تیار کی تو اسے سماج سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن مال تیار کرنے میں ہوتا یہ ہے کہ آدمی صرف وہی چیز نہیں بناتا جو کسی سماجی ضرورت کی تسکین کر دے بلکہ خود اس کی محنت بھی اس مجموعی مقدار محنت کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے جو سماج نے چیزوں کے بنانے پر خرچ کی ہے ہر آدمی کی محنت اس محنت کی تقسیم کی پابند ہے جو سماج کے اندر جاری ہوتی ہے۔ سماجی محنت کی

دوسری کڑیوں سے الگ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ انہی کو جوڑنے اور ان کا حصہ بننے میں یہ ذاتی محنت کام آتی ہے۔

جب ہم مالوں کو قدریں شمار کرتے ہیں تو ہماری نظر میں ان کا صرف ایک ہی پہلو ہوتا ہے کہ وہ حاصل کی ہوئی، سمٹی ہوئی، اور آپ چاہیں تو یوں کہئے کہ ٹھوس شکل میں سمائی ہوئی سماجی محنت ہیں۔ اس حیثیت سے ان میں اگر کوئی فرق ہے تو اس بات کا کہ محنت کی کم مقدار لگی ہے یا زیادہ۔ مثلاً ایک ریشمی رومال تیار کرنے میں محنت کی زیادہ مقدار لگی ہوگی اور اینٹ تیار کرنے میں کم۔ سوال کہ ہے کہ محنت کی مقدار کیسے ناپی جائے؟

ناپ ہوگا جتنی دیر محنت کی گئی وہ وقت۔ گھنٹوں اور دنوں وغیرہ کے حساب سے محنت ناپی جائے گی۔ اور اس ناپ سے کام لے کر ہم سب طرح کی محنتوں کا ایک اوسط یا معمولی محنت کی سطح پر لا کر ان کیا کائی معلوم کر لیں گے۔

چنانچہ اب ہم اس نتیجے پر: مال میں ایک ویلیو ہوتی ہے، وجہ یہ کہ سماجی محنت کا ایک ٹھوس شکل اختیار کرنا ہی مال ہے۔ اس کی ویلیو سائز یا نسبتی ویلیو کتنی بڑی ہے، یہ بات منحصر ہے اس پر کہ جو سماجی جوہر اس مال میں موجود ہے وہ زیادہ ہے یا کم۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ اس مال کی تیاری میں جو مجموعی محنت صرف ہونی لازم ہے اس کی نسبتی کمی بیشی پر ویلیو کا سائز منحصر ہوتا ہے۔ مختلف مالوں کی قدروں کا باہم کم و بیش ہونا اس سے طے پاتا ہے کہ ان میں محنت کی کتنی کتنی مقدار لگ چکی ہے، کھپی ہوئی ہے، یا جمع ہے۔ محنت کے یکساں وقت میں جو مال بنتے ہیں ان کی مالیت بھی یکساں ہوتی ہے۔ یا یوں کہیں کہ ایک مال کی ویلیو دوسرے مال کی ویلیو سے وہی نسبت رکھتی ہے جو نسبت ایک مال میں لگی ہوئی محنت اور دوسرے مال میں لگی ہوئی

محنت کے درمیان ہوتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میں سے اکثر لوگ سوال کر بیٹھیں گے کہ مال کی قدریں اجرت سے طے پانے میں یا محنت کی جتنی مقدار اس مال کی تیاری میں لگنی ضروری ہے، اس مقدار کی نسبت سے طے پانے میں کیا واقعی اتنا بڑا یا کچھ بھی فرق پڑتا ہے؟ آپ یہ تو ضرور مانتے ہیں کہ محنت کا انعام اور محنت کی مقدار، یہ دونوں بالکل الگ چیز ہیں۔ آیئے، فرض کریں کہ ایک بوری گیہوں میں اور ایک اونس سونے میں برابر کی محنت لگی ہوئی ہے۔ میں نے یہ مثال اس لئے اختیار کی کہ بنجامن فرینکلن نے 1729 میں شائع شدہ اپنے پہلے مضمون میں یہی مثال لی تھی۔ مضمون کا عنوان تھا" کاغذی کرنسی کی فطرت اور ضرورت کے بارے میں ایک ہلکی سی تحقیق "۔ ویلیو کی اصلیت ٹٹولنے کی یہ بھی ایک اولین کوشش تھی۔ خیر تو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ گیہوں کی ایک بوری اور ایک اونس سونے میں برابر کی ویلیو ہے یا قدر میں دونوں مساوی ہیں کیوں کہ دونوں میں اوسط درنے کی محنت کی ایک سی مقدار ٹھوس شکل اختیار کئے ہوئے ہے، اتنے دن یا اتنے ہفتے کی محنت ان کے اندر اکٹھی ہوگئی ہے۔ اس طرح سے جب ہم سونے اور اناج کی نسبتی قدریں طے کرے ہیں تو کیا کہیں ان اجرتوں کا حوالہ بھی آتا ہے جو زراعت کے محنتی کو یا کان کھودنے والے کو دی گئی ہے؟ قطعی نہیں۔ ہم اس کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کرتے کہ ان دونوں کی روزانہ یا ہفتہ واری محنت کیونکر ادا کی گئی بلکہ یہ وال تک درمیان میں نہیں آتا کہ ان مالوں میں اجرتی محنت گیہوں کی ایک بوری میں لگی ہے، ممکن ہے اسے اجرت میں صرف اناج کے دو تھیلے ملے ہوں، اور جس نے کان پر کام کیا اسے سونے کا آدھا اونس مل گیا ہو۔ یا فرض کیجئے کہ ان کی اجرتیں برابر تھیں، تب بھی ممکن ہے کہ جو مال انہوں نے تیار کئے ہیں ان کی قدروں سے اجرتوں کا

تناسب انتہائی مختلف رہا ہو۔ مال کی قدروں کے سامنے وہ آدھا ہو۔ تہائی، چوتھائی یا پانچواں حصہ ہو، ایک بوری اناج اور ایک اونس سونے کا کوئی سا حصہ ہوسکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو مال انھوں نے تیار کیا ہے اس کی ویلیو کی حد سے اجرت بڑھ نہیں سکتی، زیادہ نہیں ہوسکتی، لیکن کم ہونے کو وہ کتنی بھی کم ہوسکتی ہے۔ تیار شدہ مال کی قدروں نے ان کی اجرتوں کی حد مقرر کر رکھی ہے لیکن اجرتوں نے تیار شدہ مال کی قدروں پر حد نہیں لگائی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مثال میں اناج اور سونے کی قدریں، نسبتی قدریں، لگی ہوئی محنت کی ویلیو یعنی اجرت شمار کئے بغیر ہی طے ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا مالوں میں جتنی جتنی مقدار لیبر کی لگی ہوئی ہے، اسی نسبت سے مالوں کی قدریں طے پانا قطعی اور بات ہے، اور یہ طریقہ کہ محنت کی ویلیو یعنی اجرت کی نسبت سے مالوں کی قدریں طے پانا بالکل دوسری چیز ہے۔ آگے کی چھان بین میں یہ نکتہ اور بھی واضح ہو جائے گا۔

کسی مال کی قدر مبادلہ (اکس چینج ایبل ویلیو exchangeable value) نکالتے وقت ہمیں چاہئے کہ پیداوار کے آخری مرحلے پر محنت کی جتنی مقدار لگی ہے اسی میں پہلے کی لگی ہوئی محنت کی مقدار بھی جوڑ لیں۔ یعنی اتنی محنت جو اس کے کچے مال پر خرچ ہو چکی ہے، اوزار، کل پرزے، مشین اور بلڈنگ پر لگ چکی ہے، جس سے بعد کی محنت کو مدد ملی۔ مثال کے طور پر سوتی دھاگے کی کسی ایک مقدار کی ویلیو معلوم کرنے کے لئے روئی کی کتائی ہوتے وقت لگی ہوئی محنت کی مقدار کو محنت کی اس مقدار کے ساتھ جوڑیں جو خود روئی تیار ہونے میں لگ چکی ہے۔ اور اسی میں محنت کی وہ مقدار بھی جو کوئلے، تیل اور دوسرے استعمالی مسالوں میں کھپی ہوئی ہے، پھر وہ مقدار جو بھاپ کے انجن میں، تکلیوں اور سانچوں میں،

فیکٹری کی عمارت میں کھپی ہوئی ہے، یہ سب یکجا کی جائیں گی۔ وہ جو بجا طور پر پیداوار کے اوزار کہلاتے ہیں، جیسے اوزار، مشین، عمارتیں پیداوار کے مسلسل عمل میں تھوڑے یا بہت عرصے کے لئے برابر کام دیے جاتے ہیں۔ اگر وہ بھی کچے مال ہی کی طرح ایک دم استعمال میں آکر تمام ہو جائیں تو ان کی بھی تمام ویلیو ان مالوں پر ڈال دی جائے گی جنھیں تیار کرنے میں وہ کام آتے ہیں۔ مگر چوں کہ ان کا مصرف رفتہ رفتہ ہوتا ہے، جیسے سوتی مل کا سانچہ دیر تک چلتا ہے تو اس کا بھی کارکردگی کی مدت کے حساب سے ایک اوسط نکالا جاتا ہے اور اس حساب سے کسی مقررہ مدت مثلاً ایک دن کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کا اوسط نکل آتا ہے۔ اس طرح ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک سانچے کی پوری ویلیو کا کتنا حصہ ایک دن کی کتائی میں نکل جاتا ہے اور اسی طرح یہ بھی کہ ایک پونڈ دھاگے کے اندر محنت کی جو کل مقدار لگی ہوئی ہے اس میں محنت کی کتنی مقدار پہلے سے خرچ ہو کر ایک سانچے کے حصے میں آچکی تھی۔ جو مقصد فی الحال پیش نظر ہے، اس کا تقاضا ہے کہ زیر بحث نکتے کو زیادہ نہ پھیلائیں۔

ممکن ہے یوں نظر آئے کہ اگر کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار سے ہی طے ہوئی ٹھہری جو مال کی تیاری میں کھپ گئی ہے تو پھر آدمی جتنا سست یا کام چور ہوگا اس کے مال کی ویلیو بھی اتنی ہی بڑھ جائے گی کیوں کہ مال پر اپنا کام پورا کرنے میں وہ محنت کا اور بھی زیادہ وقت لگائے گا۔ نہیں، یہ افسوسناک غلط فہمی ہوگی۔ یاد کیجئے کہ میں نے "سماجی محنت" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس ایک "سماجی" کی شرط میں کئی نکتے پوشیدہ ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار سے طے پاتی ہے جو اس پر لگائی گئی یا اس میں ٹھوس طریقے سے موجود ہے تو ہمارا مطلب ہے کہ

محنت کی وہ مقدار جو اس مال کی تیاری کے لئے لازم ہے، سماج کی ایک خاص حالت میں، پیداوار کے جو اوسط سماجی حالات ہیں ان میں، کام کی رفتار کا جو سماجی اوسط ہے اور لیبر کی ہنرمندی یا قابلیت کے اوسط درجے میں۔ انگلینڈ میں جب پاور لوم نے ہینڈ لوم (کھڈی کی بنائی) سے مقابلہ شروع کیا تو دھاگے کی مقررہ مقدار کو ایک گز سوت یا ایک گز کپڑا بنانے کے لئے پہلے سے صرف آدھا وقت محنت کافی ہونے لگا۔ ہاتھ کے بنکر غریب جو پہلے نو دس گھنٹے روزانہ کام کیا کرتے تھے، اب انہیں روزستر ہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑ گیا۔ پھر بھی جتنا مال وہ بیس گھنٹے کی محنت سے تیار کرتے تھے وہ سماجی وقت محنت کے دس گھنٹے کے برابر رہا، یا یوں کہئے کہ دھاگے کی مقررہ مقدار کو سوتی کپڑا بنانے میں دس گھنٹے کی محنت سماجی طور پر لازم رہ گئی۔ چنانچہ اب بیس گھنٹے میں جو مال ہاتھ کے بنکر نے تیار کیا اس کی ویلیو اتنی ہی رہ گئی جتنی پہلے دس گھنٹے میں تیار کئے ہوئے مال کی ہوا کرتی تھی۔

غرضکہ تیار ہونے والے مال میں جو سماجی طور سے لازمی محنت لگی ہوئی ہے، اس محنت کی مقدار سے ہی مال کی قدر مبادلہ طے پاتی ہے تو اس مال کی تیاری کی خاطر محنت کی مقدار جتنی بڑھے گی، وہ مال کی ویلیو بھی بڑھا دے گی اور محنت کی مقدار جتنی گھٹے گی، مال کی ویلیو بھی اتنی ہی گھٹا دے گی۔

الگ الگ مالوں کی تیاری کے لئے جتنی محنت ضروری ہے اگر اس کی الگ الگ مقدار ایک حال پر قائم رہتی ہے تو ان کی نسبتی قدروں کو بھی قائم رہنا چاہئے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ کسی مال کی تیاری کے لئے محنت کی جو مقدار لازم ہوتی ہے وہ برابر بدلتی رہتی ہے اس لیبر کی پیداواری طاقت کے فرق کے ساتھ جس سے کام لیا گیا ہے۔ لیبر کی پیداواری طاقت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ مال ایک مقررہ وقت

محنت میں بن کر تیار ہوگا۔ اور اسی طرح لیبر کی پیداواری طاقت جتنی کم ہوگی، اتنا ہی کم مال اسی وقت محنت میں بن کر تیار ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ کمزور زمینوں پر کاشت کرنا ضروری ہو جائے تو پیداوار کی وہی پہلے کی سی مقدار حاصل کرنے کے لئے محنت کی زیادہ مقدار خرچ کرنی پڑے گی، نتیجہ یہ کہ زرعی پیداوار کی ویلیو برابر بڑھتی جائیگی۔ اب دوسری طرف سے دیکھئے کہ اگر پیداوار کے جدید ذریعوں سے کام لے کر کوئی ایک بنکر کپاس کی مقدار کو جس کام کے ایک دن کے دوران چرخی کاتا کرتی تھی، اتنی ہی وقت میں اس سے کئی ہزار گنا دھاگا بنا کر رکھ دیتا ہے تو یہ ظاہر بات ہے کہ کپاس کا ہر ایک پونڈ پہلے کے مقابلے میں کتائی کی محنت ہزاروں گنی کم جذب کریگا۔ نتیجہ یہ کہ کپاس کے ایک ایک پونڈ میں کتائی سے جو ویلیو بڑھ جایا کرتی تھی، وہ پہلے سے ہزاروں گنا کم ہو جائے گی اور اسی حساب سے دھاگے کی ویلیو بھی بہت نیچے جائے گی۔

مختلف لوگوں کی قدرتی صلاحیت، طاقت اور کام کرنے کے خاص اکتسابی تجربے کا جو فرق ہوتا ہے، اس سے قطع نظر لیبر کی پیداواری طاقت خاص طور سے ان باتوں پر منحصر ہے:

اول، تو محنت کے قدرتی حالات پر، مثلاً زمین کی زرخیزی، کانوں وغیرہ کی حالت پر؛

دوسرے، لیبر کی سماجی طاقت کی رفتہ رفتہ بہتری پر۔ ایسی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں تب جب بڑے پیمانے پر مال تیار کیا جائے، بڑا سرمایہ لگا ہو اور لیبر بہت اکٹھی ہو چکی ہو، محنت کی تقسیم در تقسیم چلی گئی ہو، مشینری، ترقی یافتہ طریقے، کیمیکل اور دوسری قدرتی صلاحیتوں کا استعمال ہو، رسل و رسائل اور سامان لانے

لے جانے کی سہولت کے ذریعے وقت اور جگہ کی بچت کی گئی ہو، اور بھی مختلف ایجادوں سے جن کے ذریعے سائنس قدرتی صلاحیتوں کو انسانی محنت کی خدمت میں لگا دیتی ہے اور جن کی بدولت لیبر کا سماجی یا مل کر کام کرنے والا کردار ابھر آتا ہے۔ لیبر کی پیداواری طاقتیں جتنی بڑھتی جائیں گی سامان کی ایک مقدار تیار کرنے میں اتنی ہی کم محنت کھپے گی اور اس کے باعث مال کی ویلیو بھی اور گھٹ جائے گی اور لیبر کی طاقت جتنی کم ہو گی سامان کی پہلے والی مقدار تیار کرنے میں اتنی ہی زیادہ محنت کھپے گی۔ پس اس کی ویلیو بھی اور بڑھ جائے گی۔ اب ایک کلیے کی شکل میں ہم اسے یوں رکھتے ہیں کہ: مالوں کی قدریں سیدھے سیدھے محنت کے اس وقت سے مناسبت رکھتی ہیں جو اس سامان کی تیاری میں لگا ہے، اور دوسری سمت میں وہ لگی ہوئی محنت کی پیداواری طاقت سے الٹی مناسبت رکھتی ہیں۔

اب تک ساری گفتگو ویلیو (قدر) پر ہوتی رہی، اب کچھ قیمت کے بارے میں بھی کہتا چلوں۔ قیمت ہی ایک نرالا روپ ہے ویلیو کا۔

قیمت بجائے خود کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ نقدی کی صورت میں ظاہر ہونے والی ویلیو ہے۔ مثلاً یہاں، انگلینڈ میں جتنے مال بن کر نکلتے ہیں ان کی ویلیو سونے کی قیمتوں میں ظاہر کی جاتی ہے اور برا عظم یورپ کے سارے مالوں کی قدریں چاندی کی قیمتوں میں۔ دوسرے مالوں کی طرح خود سونے چاندی کی قیمتیں بھی محنت کی اس مقدار کی پابند ہیں جو ان دونوں دھاتوں کے حاصل کرنے میں کھپنی ضروری ہے۔ آپ اپنی قومی پیداوار کی ایک خاص مقدار جس میں آپ کی قومی محنت کی ایک خاص مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے سونا اور چاندی پیدا کرنے والے ملکوں کے ہاتھ بدلتے ہیں اور ان ملکوں کا سامان لیتے ہیں جس میں ان ملکوں کی محنت کی

بھی ایک خاص مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے۔ اس طرح مال کی ادلا بدلی سے آپ سونے اور چاندی کی صورت میں تمام مالوں کی قدریں ظاہر کرنے لگتے ہیں یعنی جتنی جتنی محنت ان پر لگ چکی ہے اس کا اظہار سونے، چاندی میں کرتے ہیں۔ ویلیو کا نقدی میں جو اظہار ہوتا ہے یا اسی کو یوں کہہ لیجئے کہ ویلیو جو قیمت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو اگر اور گہرائی تک دیکھئے تو یہ کھلے گا کہ ایک سلسلہ وار عمل ہے جس کے ذریعے آپ تمام مالوں کی قدروں کو الگ سے اور ایک سا روپ دے دیتے ہیں یا جس کے ذریعے آپ یوں کرتے ہیں کہ برابر کی سماجی محنت کی مقداروں میں تمام مالوں کی ویلیو ظاہر ہو جائے۔ قیمت کی یہ جو حیثیت ہے کہ وہ نقدی کے روپ میں ظاہر ہونے والی ویلیو ہی ہوتی ہے۔ تو اس کا نام آدم اسمتھ نے نیچرل پرائس رکھا ہے اور فرانسیسی Physiocrats (21) نے اسے "لازمی قیمت" (Prix necessairs) کہا ہے۔

اچھا تو ویلیو اور بازار کی قیمتوں میں یا یوں کہیں کہ قدرتی قیمتوں اور بازار کے داموں میں کیا نسبت ہے؟ آپ سب کو معلوم ہے کہ کسی ایک قسم کے تمام مالوں کے بازار دام ایک ہی ہوتے ہیں، چاہے مال تیار کرنے والوں کے اپنے حالات میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ بازار دام سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک چیز کی کوئی خاص مقدار بازار میں لانے کے لیے، اس کے پیداوار کے اوسط حالات میں سماجی محنت کی کتنی اوسط مقدار لازم ہوتی ہے۔ کسی ایک خاص قسم کے مال کی پوری کھیپ پر بازار دام کا حساب پھیلایا جاتا ہے۔ یہاں تک تو بازار دام مال کی ویلیو سے میل کھاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف بازار میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے، کبھی قدرتی قیمت یا ویلیو سے بازار اوپر گیا، کبھی نیچے اتر گیا، یہ منحصر ہے مانگ اور سپلا

ئی کے اتار چڑھاؤ پر۔ بازار کے داموں کا پلہ ویلیو کے برابر نہ ٹھیرنا مستقل نظر آتا ہے، لیکن جیسا کہ آدم اسمتھ نے کہا ہے، بات یوں ہے کہ:

"نیچرل قیمت ہی وہ بیچ کی قیمت ہے جس کی طرف تمام مالوں کی قیمتیں ہر پھر کر آتی رہتی ہیں۔ اتفاقی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو قیمتوں کو کبھی اچھا خاصا اوپر لے جا کر تھامے رہتے ہیں اور کبھی اتنی نیچے اترنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن بیچ کی اس پکی قیمت سے ہٹانے والی چاہے کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آتی رہیں۔ تاہم بار بار قیمت اسی درمیانی نقطے پر آ کر ٹھیرنا چاہتی ہے۔"(22)

میں فی الحال اس سوال کی زیادہ چھان بین نہیں کرتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر مانگ اور سپلائی میں توازن بنا رہے تو مالوں کے بازار دام ان کی نیچرل قیمتو ں سے تال میل رکھتے ہیں، یعنی اس ویلیو سے مناسبت رکھتے ہیں جو کسی مال کی تیار ی میں لگنے والی محنت کی مقدار سے ہی طے پاتی ہے۔ مگر سپلائی اور مانگ کو مستقل ایک دوسرے کا پلہ برابر رکھنے میں لگا رہنا چاہیے، حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ کبھی ایک اور دوسرا پلہ بھاری کر کے، یعنی کبھی تیز ی کو مندی سے اور کبھی اس کے برعکس کر کے وہ کمی پیشی کا حساب برابر کر لیتے ہیں۔ اگر ایک دن کی تیز ی مندی کو نظر میں رکھنے کے بجائے آپ زیادہ عرصے تک بازار کے داموں کی رفتار کا تجزیہ کریں جیسا کہ مسٹر ٹوک نے اپنی تصنیف "قیمتوں کی تاریخ" میں کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بازا ر کے داموں کا چڑھنا اترنا، ویلیو سے ہٹا رہنا، تیز ی اور مندی ایک دوسرے کا اثر زائل کرتی اور باہم تلافی کر لیتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اجارہ داری اور بعض دوسر ی وجہیں جو اثر انداز ہوا کرتی ہیں، ان سے قطع نظر کرتے ہوئے مجھے اتنا کہنا ہے کہ مالوں کی جتنی قسمیں ہوتی ہیں وہ سب کی سب اوسط میں اپنی قدروں یا نیچرل

قیمتوں پر ہی فروخت کی جاتی ہیں۔ اوسط مدت جس کے اندر بازار دام اونچ نیچ کے ذریعے اپنا حساب برابر کر لیتے ہیں، مال کی مختلف قسموں کے معاملے میں مختلف ہوتی ہے، کیوں کہ ایک قسم کا مال سپلائی اور مانگ کے مطابق خود کو زیادہ آسانی سے ڈھال لیتا ہے اور دوسرا زیادہ مشکل سے۔

اب اگر پورے پھیلاؤ کے ساتھ اور بڑی مدت کے لین دین کو نظر میں رکھ کر یہ صحیح ہے کہ مال کی سب قسمیں اپنی اپنی قدروں کے حساب سے بکتی ہیں تو یہ فرض کرنا بے معنی ہوگا کہ خود منافع، ایک آدھ معاملے میں نہیں، بلکہ مختلف کاروباروں میں مستقل اور معمول کے منافع مالوں کی قیمتوں میں اوپر سے نکالے جاتے ہیں یعنی منافع اس طرح وصول ہوتے ہیں کہ چیزوں کو ان کی ویلیو سے بڑھا کر بیچا جاتا ہے۔ اگر آپ اس مفروضے کو پھیلا کر دیکھیں تو اس کی لغویت بالکل ہی سامنے آجائے۔ اگر یوں ہوتا تو آدمی جو منافع بیوپاری کی حیثیت میں اٹھاتا وہ گاہک کی حیثیت میں ہاتھ سے دیتا رہتا۔ یہ کہنے سے کام تو چلے گا نہیں کہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بیوپاری تو ہیں گاہک نہیں یا مال اٹھانے والے (صارف) تو ہیں، بنانے والے نہیں۔ مال بنانے والے کو جو ادا کرنا ہے وہ پہلے مفت میں انہی سے وصول بھی ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص پہلے آپ سے روپیہ لے لے اور پھر مال خریدنے میں وہی روپیہ آپ کو ادا کر دے تو آپ چاہے اپنا مال اس شخص کے ہاتھ کتنا ہی مہنگا کیوں نہ بیچیں، مالدار ہونے سے رہے۔ اس طرح کے لین دین میں یہ تو ممکن ہے کہ نقصان کم ہو لیکن نفع کی کوئی گنجائش نہیں۔

لہٰذا منافع کی عام فطرت بیان کرنے کے لیے آپ کو اس کلیے سے شروع کرنا چاہیے کہ اوسط میں سارے مال اپنی اصلی ویلیو پر بیچے جاتے ہیں اور انہیں ان کی و

یلیو پر بیچ کر ہی یعنی ان کے اندر جتنی لیبر کھپی ہو اسی کی نسبت سے بیچ کر منافع نکالا جا تا ہے۔ اگر منافع کو ہم اس قاعدہ کلیہ میں نہ ڈھال سکے تو پھر منافع کی کوئی تشریح نہیں ہوسکتی۔ ظاہراً یہ ایک قول محال (Paradox) معلوم ہوتا ہے اور روزانہ کے مشاہدے کے خلاف جاتا ہے۔ لیکن یہی کیا اور بھی قول محال ہیں جیسے یہ کہنا کہ زمین سورج کا چکر کاٹتی ہے یا پانی ایسی دو گیسوں سے مل کر بنا ہے جن میں بھڑک اٹھنے کی خاصیت ہے۔ سائنسی حقیقت کو اگر آپ روزمرہ کے اس تجربے سے جانچیں جو چیزوں کا صرف رواں دواں منظر دیکھتا ہے تو وہ ہمیشہ ہی قول محال نکلے گی۔

7۔محنت کی قوت labour Power

جتنا ممکن تھا ویلیو کا، اور کسی بھی مال کی ویلیو کی فطرت کا سرسری تجزیہ کر چکنے کے بعد اب ہمیں اپنی توجہ اس طرف پھیرنی چاہیے کہ محنت کی خاص ویلیو کیا ہوتی ہے۔ اس دفعہ پھر میں ایک ظاہراً قول محال پیش کر کے آپ کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ آپ سب حضرات کو یقین ہے کہ جو کچھ آپ ہر روز بیچتے ہیں وہ ہے آپ کی محنت، یعنی محنت کی ایک قیمت ہے، اور چونکہ کسی مال کی قیمت اس کی ویلیو کا نقدی میں ظاہر ہونا ہی ہے تو محنت کی ویلیو نام کی کسی چیز کا وجود ضرور ہوا۔ لیکن عام معنوں میں محنت کی ویلیو جیسی کسی چیز کا وجود نہیں ہوتا۔ تاہم چونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسی مال کے اندر لازمی محنت کی جو مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے وہی اس کی ویلیو بنتی ہے۔ تب ہم ویلیو کے بارے میں اس کلیے کو اپناتے ہوئے یہ کیسے معین کریں کہ کام کے دن کے دس گھنٹے کی ویلیو کیا ہوئی۔ اس ایک دن میں کتنی محنت پڑی ہے؟ دس گھنٹے کی محنت۔ یہ کہنا کہ کام کے دن کے دس گھنٹے کی ویلیو برابر ہے دس گھنٹے کی محنت کے یا اتنی محنت کے جتنی اس وقت میں سمائی ہوئی ہے، یہ

لفظی الٹ پھیر بلکہ بے معنی بیان ہوگا۔ مانی ہوئی بات ہے کہ جب "محنت کی ویلیو" کے صحیح اور درپردہ مفہوم تک ہماری پہنچ ہو چکی ہے تو جیسے اجرام فلکی کی صحیح رفتار کا یقین کر چکنے کے بعد ہم ظاہرا یا محض قاعدے کی پابند حرکت و رفتار کی تشریح بھی کر سکیں گے، اسی طرح اب ہم سمجھا سکتے ہیں کہ ویلیو کی اس انمل بے جوڑ اور بظاہر ناممکن سی عملی صورت کیا ہوتی ہے۔

جو چیز مزدور بیچتا ہے، وہ براہ راست اس کی محنت نہیں ہوتی، بلکہ محنت کرنے کی طاقت (قوت محنت) ہوتی ہے جسے عارضی طور پر وہ سرمایہ دار کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ ایسی نپی تلی بات ہے کہ قانون بنا دیے گئے ہیں۔ مجھے انگلینڈ کے بارے میں تو نہیں معلوم، لیکن کم از کم یورپ کے کئی ملکوں میں ایسے قانون ہیں کہ آدمی اپنی محنت کو زیادہ سے زیادہ اتنے وقت کے لیے بیچ سکتا ہے۔ اگر وقت کی کسی طرح کی قید نہ رکھی جائے تو اگر ساری عمر چلتی رہے تو وہ فوراً انسان کو عمر بھر کے لیے ملازمت دینے والے کا غلام بنا ڈالے گی۔

ایک سب سے پرانے ماہر معاشیات اور نہایت اچھوتے خیالات کے انگریز فلسفی تھومس ھوبس نے اپنی تصنیف (Leviathan) میں بے اختیار اس نکتے کو چھولیا تھا جسے بعد والوں نے نظر انداز کر دیا۔ وہ کہتا ہے:

"اور سب چیزوں کی طرح، انسان کی ویلیو یا مالیت بھی اس کی قیمت ہے، یعنی جو اس کی طاقت استعمال کرنے کے بدلے دی جاتی ہے۔"

اگر ہم اس بنیاد سے چلیں تو جیسے اور مالوں کی ویلیو نکالتے ہیں، محنت کی ویلیو کا فیصلہ بھی کر سکیں گے۔

لیکن ایسا کرنے سے پہلے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ عجیب وغریب صورت حا

ل کیونکر سامنے آئی کہ بازار میں ایک طرف تو گاہکوں کا حلقہ ہے جس کے پاس ز مین ہے، مشین ہے، کچا مال ہے، ضروریات زندگی کا سروسامان ہے، اچھوتی زمینوں کے علاوہ ان میں سے ہر چیز محنت کی پیداوار ہے، دوسری طرف بیچنے والو ں کی صف ہے جس کے پاس بیچنے کو کچھ ہی نہیں سوائے قوت محنت کے، سوائے محنت کرنے والے بازو اور دماغ کے؟ ایک صف ایسی کہ برابر خریداری کرتی چلی جا تی ہے تا کہ منافع سے خود کو مالا مال کرتی رہے، دوسری صف لگاتار بیچتی رہتی ہے تا کہ گزراوقات کا ذریعہ کمائے۔ اس سوال کی چھان بین کا مطلب ہوگا اس چیز کی تحقیق جسے ماہرین معاشیات نے پہلے کی اور شروع والی جوڑ جمع کہا ہے اور جسے دراصل شروع کا قبضہ مخالفانہ کہنا چاہئے۔ اس تحقیق سے ہمیں پتہ چل جاتا کہ وہ جسے شروع والی جوڑ جمع کا نام دیا گیا ہے، اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ تاریخ کے سلسلہ وار عمل نے یہاں تک پہنچا دیا کہ محنت کرنے والے اور محنت کے اوزاروں کے درمیان جو شروع کی یگانگی چلی آتی تھی اس کے جوڑ کھل گئے۔ خیر یہ تحقیق میرے پیش نظر مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔ محنت کرنے والے اور محنت کے اوزار کے درمیان یہ جدائی ایک بار ہوگئی تو پھر آگے بھی قائم رہتی ہے اور لگاتار بڑھ پیمانے پر خود کو پھیلاتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب طریق پیداوار میں ایک نیا اور گہرا انقلاب برپا ہو، اس جدائی کا تختہ الٹے اور نئی تاریخی شکل میں پہلے کی سی یگانگی پھر بن جائے۔

اچھا تو قوت محنت کی ویلیو کیا ہے؟

اور مالوں کی طرح قوت محنت کی ویلیو بھی یوں ہی طے ہوتی ہے کہ اسے پیدا کرنے کے لئے محنت کی کتنی مقدار لازم ہے۔ انسان کی محنت کی طاقت صرف اس

میں ہے کہ وجود جیتا جاگتا رہے۔ضروریات زندگی کی بہت ساری چیزیں ہیں کہ انسان اپنی نشو ونما اور زندگی باقی رکھنے کے لئے انہیں استعمال میں لاتا ہے۔لیکن مشین کی طرح آدمی بھی ٹوٹ کر رہ جاتا ہے،اس کی جگہ لینے کو دوسرا آدمی چاہئے۔ خود اپنا وجود باقی رکھنے کی خاطر جو بہت ساری چیزیں اسے درکار ہوتی ہیں،ان کے علاوہ اسے ضروریات کی ایک اور مقدار بھی حاصل کرتی ہے تاکہ بچوں کی کسی ایک تعداد کو پال پوس کر بڑا کرے جو محنت کے بازار میں اس کی جگہ کھڑے ہو جائیں اور مزدوروں کی یہ نسل ہمیشہ چلتی رہے۔پھر یہ کہ اس کی قوت محنت کو بڑھانے اور کوئی خاص ہنر ہاتھ میں لینے کی خاطر اور بھی کچھ قدریں خرچ کرنا پڑیں گی۔ ہماری موجودہ بحث کے لئے صرف اوسط محنت پر غور کرنا کافی ہوگا جس کی تعلیم اور ترقی پر برائے نام ہی خرچ آتا ہے۔تاہم اس موقع پر میں یہ جتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مختلف قسم کی قوت محنت پیدا کرنے کی لاگت میں چونکہ فرق ہوتا ہے اس لئے کاروبار کی مختلف شاخوں میں لگی ہوئی قوت محنت کی ویلیو میں بھی فرق ہونا لازم ہے۔لہٰذا یہ چیخ پکار کہ اجرتوں میں مساوات ہو،ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور ایسی جنونی تمنا ہے جو کبھی پوری نہیں ہونے والی۔یہ شوشہ چھوڑا ہوا ہے اس فرضی اور سطحی گرم سیاست کا جو مبدیات تو اپنا لیتی ہے لیکن نتیجوں سے جان چراتی ہے۔مزدوری کے نظام میں قوت محنت کی ویلیو اسی طرح طے پاتی ہے جیسے دوسرے کسی بھی مال کی۔اور چونکہ محنت کرنے کی مختلف طاقتوں کی قدریں بھی مختلف ہوتی ہیں، یا یہ کہ انھیں وجود میں لانے کے لئے محنت کی مختلف مقداریں درکار ہوتی ہیں اس لئے محنت کے بازار میں ان کے دام بھی الگ الگ ہونے لازمی ہیں۔اجرتوں کے اس نظام کے ہونے یہ تمنا کرنا کہ محنت کا صلہ سب کو برابر یا کچھ نہیں تو منصفانہ ملنے لگے، یہ ایسی

ہی بات ہے جیسے غلامی کے نظام کے ہوتے آزادی کے خواب دیکھنا۔ جس بات کو آپ انصاف کا تقاضا یا منصفانہ سمجھ رہے ہیں اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ سوال صرف اتنا ہے کہ ایک مقررہ نظام پیداوار میں کیا ہونا لازمی ہے جس سے مفر نہیں۔ اب تک جو کہا گیا اس سے یہ واضح ہو گیا کہ قوت محنت کی ویلیو طے پاتی ہے ان ضروریات کی ویلیو سے جو محنت کی اس قوت کو پیدا کرنے، بڑھانے، باقی رکھنے اور آئندہ جاری رکھنے میں درکار ہوتی ہیں۔

8۔ قدر زائد کی پیداوار Surplus Value

اب ہم فرض کرتے ہیں محنت کرنے والے کی روزمرہ ضروریات کی اوسط مقدار تیار کرنے کے لئے چھ گھنٹے روز کی اوسط محنت درکار ہے۔ یہ بھی فرض کیجئے کہ چھ گھنٹے کی اوسط محنت سونے کی ایک مقدار میں سمائی ہوئی ہے اور یہ مقدار ہے 3 شلنگ کے برابر۔ تو بھر تین شلنگ قیمت ٹھیری یا اس آدمی کی قوت محنت کے ایک دن کی ویلیو اتنی نقدی میں ظاہر ہوئی۔ اگر وہ چھ گھنٹے روز کام کرے تو روزانہ اتنی ویلیو پیدا کرے گا جتنی روزمرہ ضروریات کی اوسط مقدار خریدنے کے لئے کافی ہے یا محنت کرنے والے کی حیثیت میں اسے باقی رکھنے کو پوری پڑتی ہے۔

لیکن یہ آدمی اجرت پر کام کرتا ہے۔ اس لئے اپنی قوت محنت سرمایہ دار کے ہاتھ بیچنی ہی ہے۔ اگر وہ تین شلنگ روز پر بیچے یا 18 شلنگ فی ہفتہ پر، تو وہ اپنی قوت اس کی ویلیو کے حساب سے بیچ رہا ہے۔ فرض کیجئے، کتائی کا کام کرتا ہے۔ اگر وہ چھ گھنٹے روز کام کرے تو جو کپاس کی ویلیو میں تین شلنگ روز کی ویلیو بڑھاتا ہے۔ یہ جو ویلیو اس نے بڑھائی ہے، یہ ٹھیک اتنی ہی ہے جتنی اسے اجرت ملتی ہے یا روزانہ اپنی محنت کی قیمت کے طور پر وصول ہوتی ہے۔ اس حالت میں سرمایہ دار کو نہ تو کوئی

زائد قدر رہا تھ آئی، نہ زائد پیداوار۔ یہاں ہم الجھن میں پھنستے ہیں۔

جب سرمایہ دار مزدور سے محنت کی طاقت خریدتا ہے اور اس کی قدر ادا کر دیتا ہے تو دوسرے خریداروں کی طرح اسے بھی یہ حق پہنچا کہ اپنے خریدے ہوئے مال کو خرچ یا استعمال کرے۔ آپ ایک آدمی کی قوت محنت خرچ یا استعمال کرتے ہیں اسے کام میں لگا کر، ٹھیک اسی طرح جیسے کسی مشین کو چلا کر اسے صرف یا استعمال کرتے ہیں۔ کام کرنے والے کی قوت محنت کی ویلیو روز کے روز یا ہفتہ وار ادا کر کے سرمایہ دار نے یہ حق حاصل کی ہے کہ پورے دن یا ہفتہ بھر کے لئے اس قوت محنت کا استعمال کرے یا سے کام سے لگائے رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ کام کا ایک دن یا ایک ہفتہ بھی کچھ حدود کا پابند ہے لیکن ان حدود پر ہم بعد میں زیادہ نزدیک غور کریں گے۔

فی الحال ایک فیصلہ کن نکتے کی طرف آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ قوت محنت کی ویلیو تو پابند ہے محنت کی اس مقدار کی جو اسے باقی رکھنے یا پھر سے پیدا کرنے کے لئے لازم ہوتی ہے، لیکن اس قوت محنت کا استعمال وہاں تک ہوتا ہے جہاں تک مزدور میں کام کرنے کی طاقت اور جسمانی قوت موجود ہے۔ قوت کا عمل میں آنا کچھ اور، اسی طرح جیسے گھوڑا جو خوراک طلب کرتا ہے، وہ اور جتنی دیر وہ شہسوار کو سواری دیتا ہے، دونوں بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ محنت کی وہ مقدار جس پر کام کرنے والے کی قوت محنت کی ویلیو نے حد کھینچی ہوئی ہے ہرگز محنت کی اس مقدار کو محدود نہیں کرتی جو اس کی قوت محنت انجام دینے قابل ہوتی ہے۔ کتائی کرنے والے کی ہی مثال لے لیجئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روزانہ اپنی قوت محنت کو پھر سے پیدا کرنے کے لئے اسے ہر روز تین شلنگ کی ویلیو پیدا کر کے دینی ہے جو چھ گھنٹے

کے کام سے وہ پوری کر دیتا ہے۔مگر اس کے سبب یہ نہیں ہوتا کہی اب دس، بارہ یا بارہ سے زیادہ گھنٹے کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ لیکن کتائی کرنے والے کی قوت محنت کو روزانہ یا ہفتہ واری ویلیو ادا کر کے سرمایہ دار نے یہ حق پایا ہے کہ محنت کی اس قوت کو سارے دن یا سارے ہفتے استعمال کرے۔لہٰذا اب مثال کے طور پر بارہ گھنٹے بھی اس سے کام لے گا۔ان چھ گھنٹوں کے علاوہ جو اس کی اجرت کی یا قوت محنت کی ویلیو ادا کرنے کی لئے لازم لیں اسے اوپر سے چھ گھنٹے اور کام کرنے پڑے گا جنھیں میں زائد محنت کے گھنٹے کہتا ہوں یعنی وہ فالتو محنت جو خود کو قدر زائد (Surplus value)اور زائد پیداوار میں بدل دیتی ہے۔اگر وہ کتائی کرنے والا شخص اپنی روز کی چھ گھنٹہ محنت سے کپاس میں تین شلنگ کی ویلیو بڑھاتا ہے،یعنی جتنی اجرت پائی ہے اس کے بالکل مساوی،تو وہ بر ہ گھنٹے کام کر کے چھ شلنگ کی مالیت اس کپاس کو دے دیتا ہے اور اسی نسبت سے زائد دھاگا تیار کرتا ہے۔مگر جب وہ اپنی قوت محنت سرمایہ دار کے ہاتھ بیچ چکا تو اس نے جتنی بھی ویلیو یا سامان تیار کیا وہ بھی سرمایہ دار کی ملکیت ٹھہرا کیوں کہ وہی وقتی طور پر اس کی قوت محنت کا مالک ہے۔ظاہر ہے کہ سرمایہ دار تین شلنگ مزدور کو دے کر چھ شلنگ کی ویلیو وصول کرے گا کیونکہ اتنی ویلیو کے بدلے جس میں محنت کے چھ گھنٹے موجود ہیں،وہ ایسی ویلیو وصول کرتا ہے جس میں محنت کے بارہ گھنٹے جمع ہیں۔روزانہ اسی عمل کو دوہرا کر سرمایہ دار ہر روز تین شلنگ دیتا اور چھ شلنگ اپنی جیب میں ڈالتا رہے گا جس کا آدھا حصہ پھر اجرت کی شکل میں دیا جائے گا اور باقی آدھا فالتو ویلیو (قدر زائد) بنتا جائے گا جس کے عوض سرمایہ دار کو کچھ ادا نہیں کرتا۔سرمائے اور محنت کے درمیان تبادلے کا یہ ہے وہ انداز جس پر سرمایہ داری پیداوار یا اجرت کا نظام کھڑا ہوا ہے اور

جس کا مستقل نتیجہ یہی ہوگا کہ محنت کرنے والے کو پھر مزدور اور سرمایہ دار کو پھر سرمایہ دار بناتا چلا جائے۔

باقی سب حالات یکساں ہوں تو قدر زائد کی شرح منحصر ہوتی ہے اس پر کہ قوت محنت کی ویلیو پھر سے پیدا کرنے کے لیے کام کے جتنے گھنٹے دینے ضروری ہیں ان میں اور جو زائد وقت یا زائد محنت سرمایہ دار کے لئے دئے گئے ان میں کیا تناسب ہے۔لہٰذا جس حد تک مزدور اپنی قوت محنت کی ویلیو یا اجرت کا حساب پورا کرنے کے لئے کام کرتا ہے،ان گھنٹوں سے زائد یا فالتو کام کے جتنے گھنٹے ہوں گے،ان دونوں وقتوں کے تناسب پر قدر زائد کی شرح منحصر رہے گی۔

9۔محنت کی ویلیو Value of Labour

اب ہمیں اسی بیان کی طرف واپس آنا ہوگا کہ " محنت کی ویلیو یا اس کی قیمت"۔

ہم نے دیکھ لیا کہ حقیقت میں وہ صرف قوت محنت کی ویلیو ہے جو اس سامان کی قدروں میں ناپ کر دی جاتی ہے جس سامان کا ہونا لازمی ہے قوت محنت باقی رکھنے کے لئے۔لیکن چونکہ محنت کرنے والے کو کام پورا چکنے کے لئے۔لیکن چونکہ محنت کرنے والے کو کام پورا کر چکنے کے بعد اجرت ملتی ہے اور پھر وہ خود سمجھتا ہے کو اس نے سرمایہ دار کو جو کچھ دیا وہ اس کی محنت تھی تو اپنی قوت محنت کی ویلیو یا قیمت اسے لازمی طور سے خود اپنی محنت کی ہی قیمت یا ویلیو نظر آتی ہے۔اگر اس کی قوت محنت کی قیمت تین شلنگ ہو جس میں چھ گھنٹے کی محنت وصول ہو جاتی ہے اور پھر وہ بارہ گھنٹے خود چھ شلنگ کی ویلیو میں لگے ہونے ہیں۔ اس عمل کی دوہری تاثیر ہوتی ہے:

اول یہ کہ قوت محنت کی ویلیو یا قیمت ایسی نظر آتی ہے گویا خود محنت کی ہی ویلیو یا قیمت ہے۔ حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو محنت کی ویلیو یا قیمت کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔

دوسرے یہ کہ اگر چہ کام کرنے والے کی روزانہ محنت کا صرف ایک حصہ ہے جس کی اجرت ادا کی گئی، دوسرا حصہ ادائگی کے بغیر رہا۔ یہی حصہ یا زائد (فالتو) محنت اصل میں وہ ذخیرہ ہے جس مین سے قدر زائد یا منافع نکلتا ہے، لیکن بظاہر یوں نظر آتا ہے گویا مجموعی طور پر محنت کا معاوضہ دیا گیا۔

یہ ظاہر کا دھوکا اجرت پر کی ہوئی مزدوری کو محنت کی دوسری تاریخی شکلوں سے جدا کر دیتا ہے۔ اجرت کا نظام کچھ اس طرح کا بنا ہوا ہے کہ بے معاوضہ محنت بھی اجرت دی ہوئی محنت نظر آتی ہے۔ غلام کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس کی محنت کے جس حصے کا معاوضہ دیا جاتا تھا وہ بھی دیکھنے میں مفت کی بیگار تھی۔ لازمی بات ہے کہ کام کرنے کی خاطر غلام کو زندہ رہنا چاہئے لہٰذا محنت کے دن کا ایک حصہ اس ویلیو کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے جو اس کا وجود باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن چونکہ کہ غلام اور آقا کے درمیان کوئی سودا نہیں ہوتا اور فریقین میں خرید و فروخت کا معاملہ نہیں بنتا تو اس کی ساری محنت یوں نظر آتی ہے گویا مفت کی تھی۔

اب دوسری طرف زمین سے بندھے ہوئے (نیم غلام) کسان کو لے لیجئے جو ابھی کل تک سارے مشرقی یورپ میں موجود تھا۔ یہ کسان، مثلاً تین دن تو خود اپنے کھیت پر، یا جو کھیت اسے سونپا گیا ہے، وہاں اپنے لئے کام کرتا تھا اور باقی کے تین دن آقا یا مالک کی جاگیر پر جبری محنت یا بیگار بھرتا تھا۔ یہاں پھر محنت کا وہ حصہ جس کا معاوضہ ملا، اور وہ جس کا نہیں ملا، سلیقے کے ساتھ الگ الگ تھے، وقت اور مقام میں بھی جدا جدا تھے۔ ہمارے آزاد خیالوں کو اس پر بے حد غصہ آیا کرتا تھا کہ

آدمی سے اور بے معاوضہ محنت لی جائے ۔اس کو وہ اخلاقی گراوٹ سمجھتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ چاہے ایک آدمی ہفتے کے تین دن خود اپنے کھیت پر اپنے لئے اور باقی کے تین دن مالک کی جاگیر پر بے معاوضہ محنت کرتا ہے، چاہے وہ کسی کارخانے یا ورکشاپ میں چھ گھنٹے روز اپنے لئے اور چھ گھنٹے مالک کے لئے کام کرتا ہے بات ایک ہی ہوئی۔ اگرچہ فیکٹری یا ورکشاپ کے معاملے میں معاوضہ والی اور بے معاوضہ محنت، دونوں ایک دوسری میں ایسی گتھی ہوئی ہیں کہ الگ نہیں کیا جا سکتا، اور اس پورے لین دین کی فطرت پر یہ پردہ پڑا ہوا ہے کہ درمیان میں ایک معاہدے کا دخل ہے اور ادائگی ہوتی ہے ہفتہ پورا ہونے کے بعد۔ بے معاوضہ محنت ایک معاملے میں اپنی مرضی سے پیش کی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے معاملے میں زبردستی کی۔ لے دے کر بس اتنا سا فرق ہے ان دونوں میں۔

اب جو میں "محنت کی ویلیو" کا لفظ استعمال کروں گا تو محض غلط العام معنوں میں، جس کا مطلب ہے "قوت محنت کی ویلیو"۔

10۔ کسی مال کو اس کی ویلیو پر فروخت کر کے منافع کمایا جاتا ہے

فرض کیجئے۔ محنت کا ایک اوسط گھنٹہ جو ویلیو میں لگا ہوتا ہے، وہ چھ پینس کے برابر ہے، یا بارہ اوسط گھنٹے چھ شلنگ کی ویلیو کے برابر ٹھہرتے ہیں۔ آگے فرض کیجئے کہ محنت کی ویلیو تین شلنگ یا اتنے سامان کے برابر ہوئی جتنا چھ گھنٹے کی محنت نے پیدا کیا ہے۔ اب اگر کچے مال، مشین اوزار وغیرہ میں، جو کسی مال کی تیاری میں استعمال ہوتے ہے، چوبیس گھنٹے کی اوسط محنت لگی ہوئی ہے تو اس کی ویلیو بارہ شلنگ تک پہنچے گی۔ اور پھر سرمایہ دار نے جس آدمی کو محنت پر لگایا ہے اس نے پیداوار کے ذریعوں پر اپنی بارہ گھنٹے کی محنت بڑھائی ہو تو ان بارہ گھنٹوں نے چھ شلنگ کی مزید ویلیو پیدا کی۔

اب اس مال کی پوری ویلیومل کر وصول شدہ محنت کے چھتیس گھنٹے اور اٹھارہ شانگ کے برابر ہوگئی۔مگر چونکہ محنت کی ویلیو یا وہ اجرت جو کام کرنے والے کو دی گئی، صرف تین شانگ ہو گی تو سرمایہ دار کی طرف سے ان چھ گھنٹے کی فالتو محنت کے بدلے کچھ نہیں دیا گیا جو مزدور نے کی اور مال کی ویلیو کی صورت میں وصول ہو چکی۔ اس مال کی جو اٹھارہ شانگ ویلیو بنی ہے، اسی ویلیو پر بیچ کر سرمایہ دار کے ہاتھ تین شانگ کی ایک ایسی ویلیو آئے گی جس کے بدلے اس نے کچھ نہیں دیا۔یہی تین شانگ وہ قدر زائد یا منافع بنا ہے جو اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔سرمایہ دار کو یہ تین شانگ کا منافع برابر وصول ہوتا رہے گا، ایسا منافع جو وہ اپنا مال اصلی ویلیو سے زیادہ یا اونچی قیمت پر نہیں بلکہ اس کی اصلی ویلیو پر بیچ کر حاصل کرتا ہے۔

کسی مال کی ویلیو محنت کی اس پوری مقدار سے طے پاتی ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔اس محنت کا ایک حصہ وہ ہے جو اس ویلیو کی صورت میں موجود ہے جس کا مساوی اجرت کی شکل میں ادا کیا جا چکا، لیکن ایک حصہ ایسی ویلیو میں رہا جس کا مساوی کچھ ادا نہیں کیا گیا۔ مال کے اندر جو محنت سمائی ہوئی ہے، اس کا ایک حصہ معاوضہ والی محنت ہے اور دوسرا حصہ بے معاوضہ کی محنت۔اس لئے جب سرمایہ دار کسی مال کو اس کی اپنی ویلیو پر فروخت کرتا ہے، یعنی محنت کی اس پوری مقدار کو حساب میں لیتا ہے جو اس مال کے اندر ٹھوس شکل رکھتی ہے تو اسے منافع ہونا بہر حال لازم ہے۔صرف وہی چیز نہیں بیچ رہا ہے جس کے مساوی لاگت آچکی، بلکہ وہ شے بھی فروخت کی جا رہی ہے جس کا اسے خود کچھ نہیں دینا پڑا، البتہ مزدور کی محنت اس میں لگی ہے۔سرمایہ دار کو جو لاگت کسی مال کی پڑی ہے۔وہ ایک چیز ہے اور اس مال کی اصلی ویلیو دوسری چیز۔ چنانچہ اب میں پھر دوہراتا ہوں کہ اوسط یا معمولی

منافع کمایا جاتا ہے کسی مال کو اس کی ویلیو سے زیادہ پر بیچ کر نہیں بلکہ اصلی ویلیو پر بیچ کر۔

11۔ وہ مختلف حصے جن میں قدر زائد بکھر جاتی ہے

قدر زائد یا کسی مال کی پوری ویلیو کا وہ حصہ جس میں مزدور کی فالتو محنت یا بے معاوضہ محنت لگی ہوئی ہے، میں اسے منافع کہتا ہوں۔ یہ پورے کا پورا منافع کام لینے والے سرمایہ دار کی جیب میں نہیں جاتا۔ زمین کا اجارہ زمیندار کو یہ موقع دیتا ہے کہ اس قدر زائد کا ایک حصہ وہ لگان یا کرائے کے نام سے لے جائے، چاہے زمین کاشت کے لئے استعمال ہو، عمارت کے لئے، ریلوے یا کسی اور پیداواری مقصد کے لئے کام آئے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جب محنت کے اوزاروں کی ملکیت نے کام لینے والے سرمایہ دار کو اس قابل بنا کہ وہ قدر زائد پیدا کر سکے یا یوں کہئے کہ بے معاوضہ محنت کی ایک خاص مقدار ہتھیا سکے، تو وہ جس کے پاس محنت کے ذریعوں کی ملکیت تھی اور جو اپنی یہ ملکیت پوری کی پوری یا تھوڑی بہت کام لینے والے سرمایہ دار کو ادھار دیتا تھا، اسے بھی یہ موقع دیا، یعنی ساہوکار سرمایہ دار کو اس قبل کیا کہ وہ سود کے نام سے اسی قدر زائد کے ایک حصے پر خود اپنا حق جمالے۔ چنانچہ ان دونوں کو دینے کے بعد کام لینے والے سرمایہ دار کے پاس جتنا کچھ بچتا ہے وہ صرف اسی قدر ہے جسے صنعتی یا تجارتی منافع کہتے ہیں۔

اب رہا سوال کہ وہ کون سے اصول ہیں جن سے قدر زائد کی ساری مقداران تین قسم کے آدمیوں کے درمیان قاعدے سے تقسیم ہوتی ہے، یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اب تک جو کہا گیا اس سے یہ نتیجے نکلتے ہیں۔

لگان یا کرایہ، سود اور صنعتی منافع یہ الگ الگ نام ہیں کسی مال کی قدر زائد کے

مختلف حصوں کے، یا اس محنت کے جو مال کے اندر موجود ہے لیکن جس کا معاوضہ نہیں دیا گیا۔ یہ تینوں اسی ذریعے سے اسر صرف اسی ایک ذریعے سے نکالے جاتے ہیں۔ نہ تو خود زمین سے ان کی اگائی ہوتی ہے اور نہ سرمائے سے، البتہ زمین اور سرمایہ اپنے اپنے مالکوں کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اس قدر زائد میں سے اپنا اپنا حصہ وصول کرلیں جو کام لینے والے سرمایہ دار نے مزدور سے نکالی ہے۔ خود مزدور کی نظر میں یہ بات بعد کی ہے کہ وہ قدر زائد جو اس کی زائد یا فالتو محنت یا مفت کی محنت کا حاصل تھی، پوری کی پوری کام لینے والے سرمایہ دار نے جیب میں ڈالی یا اس کے حصے بخرے کرائے اور سود کے نام سے دوسرے فریقوں کو بھی دئے۔ فرض کیجئے جس سرمایہ دار نے کام لیا ہے، سرمایہ بھی اس نے اپنا ہی لگایا اور زمین کا مالک بھی وہ خود تھا تو اس صورت میں پوری قدر زائد اسی کی جیب میں جائے گی۔

کام لینے والا سرمایہ دار ہی ہے جو مزدور سے سیدھے سیدھے قدر زائد نکال لیتا ہے، چاہے بعد میں اس کا کتنا ہی حصہ اپنے پاس رکھ سکے۔ یہی وہ تعلق ہے، کام لینے والے سرمایہ دار اور مزدوری کرنے والے کا، جس پر سارا اجرتی نظام تو کیا، آج کا پورا نظام پیداوار ٹکا ہوا ہے۔ کچھ حضرات جو یہاں ہماری بحث میں شریک ہوئے ہیں یہ غلطی کر گئے کہ معاملے کی لیپا پوتی کر کے وہ یہ جتانے کی کوشش میں تھے کہ کام لینے والے سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان یہ تعلق ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اگرچہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ موجودہ حالات میں قیمتوں کا چڑھنا کا م لینے والے سرمایہ دار پر، زمین کے مالک پر، روپیہ دینے والے سرمایہ دار پر اور اتنا اور بڑھا لیجئے کہ ٹیکس اگھانے والے پر یکساں نہیں بلکہ مختلف درجوں میں اثر انداز ہوگا۔ یہیں سے ایک اور نتیجہ بھی نکلتا ہے۔

مال کی ویلیو کا وہ حصہ جس میں استعمال شدہ کچے مال، مشینری کی ویلیو، یا مختصر یہ کہ ذرائع پیداوار کی ویلیو شامل ہے وہ آمدنی ہرگز شمار نہیں ہوتا بلکہ صرف لگے ہوئے سرمائے کے حساب میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس سوال سے قطع نظر یہ کہنا صحیح نہیں کہ مال کی ویلیو کا وہ دوسرا حصہ جو آمدنی شمار ہوتا ہے، وہ اجرتوں، منافع، کرائے اور سود کی مدوں میں خرچ کیا جاتا ہے، وہ اجرتوں، کرائے اور منافع وغیرہ کی سب قدروں سے مل کر بنتا ہے۔ اول تو ہم اس بحث سے اجرتوں کا سوال ہی خارج کر دیتے ہیں اور صرف صنعتی منافع، سود اور کرائے پر نظر رکھیں گے۔ ا بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسی مال میں جو قدر زائد ہوتی ہے، یا اس کی ویلیو کا وہ حصہ جس میں بے معاوضہ محنت لگی ہوتی ہے، تین ٹکڑوں میں متفرق ہو جاتا ہے اور تینوں کے الگ الگ نام ہیں۔ لیکن یہ کہنا حقیقت کے بالکل برعکس ہوگا کہ مال کے اس حصے کی ویلیو ان تینوں اجزا کی الگ الگ قدروں اس میں جوڑ دینے سے بنتی ہے یا مرکب ہوتی ہے۔

اگر محنت کا ایک گھنٹہ خود کو چھ پینس کی ویلیو میں سماتا ہے، اگر مزدور کا دن بارہ گھنٹے پر پھیلا ہوا ہے، اور اس بارہ گھنٹے کا آدھا وقت بے معاوضہ محنت میں جاتا ہے تو یہ زائد یا فالتو محنت کسی مال میں تین شلنگ کی قدر زائد کا اضافہ کرتی ہے یعنی ایسی ویلیو بڑھاتی ہے جس کے عوض کچھ نہیں دیا گیا۔ تین شلنگ کی یہ قدر زائد ہی وہ پورا فنڈ ہے جس کا بٹوارہ زمیندار اور ساہوکار کے ساتھ، جس تناسب سے بھی ہو، کام لینے والا سرمایہ دار کر لے گا۔ ان تین شلنگ میں ویلیو کی وہ حد موجود ہے جس کے اندر تینوں کو حصہ بٹانا ہے۔ کام لینے والا سرمایہ دار کسی مال کی ویلیو میں اپنی طرف سے کوئی ایسی یک طرفہ ویلیو نہیں بڑھاتا جو اپنا منافع نکالنے کیلئے ہو اور

اس میں زمیندار وغیرہ کے لئے الگ سے ویلیو بڑھائی جائے، تاکہ اس طرح اوپر سے یکطرفہ بڑھائی ہوئی مقررہ قدریں مل کر ایک مجموعی ویلیو بن جائیں۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ عام خیال کتنا بے بنیاد ہے جسے نظر نہیں آتا کہ ایک مقررہ ویلیو کا تین حصوں میں بکھر جانا اور الگ الگ تین قدروں کا آپس میں آکر ملنا کیا فرق رکھتا ہے، یہ سمجھنا غلط ہے کہ ایسی حاصل جمع ویلیو جس میں کرایہ بھی ادا کیا جاتا ہے، نفع اور سود بھی نکالا جاتا ہے، جتنی چاہے بڑھائی جا سکتی ہے۔

منافع کی پوری رقم جو سرمایہ دار کو وصول ہوئی اگر سو پونڈ کے برابر ہو تو ہم اس رقم کو اس کی پوری گنجائش نظر میں رکھتے ہوئے، منافع کی رقم کہیں گے۔ لیکن اگر ان سو پونڈ اور اس سرمائے کا تناسب دیکھیں جو پیشگی دیا جا چکا ہے تو ہم اس کو نسبتی یا تقابلی گنجائش سے شرح منافع کا نام دیں گے۔ صاف بات ہے کہ یہ شرح منافع دوسرے طریقے سے خود کو ظاہر کرتی ہے۔

فرض کیجئے سو پونڈ وہ سرمایہ ہے جو اجرت میں پیشگی دیا گیا۔ اگر قدر زائد بھی سو پونڈ کی پیدا کی گئی، تو اس کا مطلب ہے کہ محنت کرنے والے کا آدھا وقت بے معاوضہ محنت میں لگ گیا۔ اب ہم اس منافع کو سرمائے کی اس ویلیو سے ناپیں جو اجرت میں دی گئی، تو ہم کہیں گے کہ شرح منافع سو فیصدی تھی کیوں کہ جتنی ویلیو پیشگی میں گئی وہ سو تھی اور جو ویلیو وصول ہوئی وہ دو سو تھی۔ لیکن دوسری طرف دیکھئے، اگر وہ سرمایہ جو اجرت میں دیا گیا، ہم صرف اسی کو شمار نہیں کرتے بلکہ اس تمام سرمائے کو حساب میں رکھتے ہیں جو پیشگی لگایا گیا، مثال کے طور پر وہ پانچ سو ہوا اور اس میں چار سو وہ ہیں جن میں کچے مال، مشین وغیرہ کی ویلیو شامل ہیں تو اب ہم کہیں گے کہ شرح منافع محض بیس فیصدی ہے، کیوں کہ جو سو پونڈ کا منافع

ہے وہ پورے لگائے ہوئے سرمائے کا صرف پانچواں حصہ ہے۔

شرح منافع ظاہر کرنے کا صرف پہلا ہی انداز ایسا ہے جس سے آپ پر صحیح نسبت ظاہر ہوتی ہے کہ کتنی محنت کا معاوضہ دیا گیا اور کتنی محنت کا نہیں، یعنی (محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا) exploitation کا (فرانسیسی لفظ کے استعمال کی اجازت دیجئے) صحیح اندازہ بتا دیتا ہے۔ لیکن شرح منافع ظاہر کرنے کا دوسرا انداز عام استعمال ہے اور واقعی اس سے بعض مقصد پورے ہوتے ہیں۔ کچھ بھی سہی، یہ انداز بہت مفید ہے یہ چھپانے کے لئے کہ سرمایہ دار محنت کرنے والے سے کتنے درجے مفت کی محنت لے لیتا ہے۔

اب آگے جو خیالات مجھ کو ظاہر کرنے ہیں وہاں لفظ منافع سے میری مراد ہوگی قدر زائد کی وہ پوری مقدار جو سرمایہ دار نکال لیتا ہے دوسرے فریقوں کے ساتھ وہ جو بھی حصہ بٹائے، مجھے اس سے مطلب نہیں۔ اور لفظ شرح منافع سے میں ہر جگہ منافعوں کو اس سرمائے کی ویلیو سے ناپوں گا جو اجرت میں دیا جاتا ہے۔

12۔ منافع، اجرت اور قیمتوں کا باہمی رشتہ

کسی مال کی ویلیو میں سے اتنی ویلیو گھٹائیے جو کچے مال اور دوسرے ذرائع پیداوار کی شکل میں استعمال ہو چکی ہے، یعنی اتنی ویلیو گھٹے جو پچھلی لیبر کی طرف سے اس مال میں شامل ہے۔ اب جو ویلیو بچی وہ محنت کی اس مقدار کا حاصل ہے جسے آخری محنت کرنے والے نے بڑھایا ہے۔ اگر اس آدمی نے بارہ گھنٹے روز کام کیا اور بارہ گھنٹے کی اوسط محنت خود کو سونے کی اتنی مقدار میں ڈھال لیتی ہے جو چھ شلنگ کے برابر ہے تو یہ صرف چھ شلنگ کی ویلیو ہی وہ ہے جسے اس کی محنت نے پیدا کیا ہے۔ یہی ویلیو جو اس کے وقت محنت سے طے پائی ہے ایسا فنڈ ہے جس کے اند

رسے محنت کرنے والا اور سرمایہ دار دونوں ہی اپنا اپنا حصہ یا فائدہ نکالتے ہیں؛ یہی ایک ویلیو ہے جو اجرت اور اور منافع میں تقسیم کی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ویلیو چاہے کسی تناسب کے فرق سے دونوں فریقوں میں بانٹی جائے اس ویلیو کی مجموعی گنجائش میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور پورے معاملے میں بھی اسباب سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں کہ ایک محنت کرنے والے کی جگہ آپ پوری مزدور آبادی کو رکھ دیں یا مثلاً محنت کے ایک دن کے بجائے آپ ایک کروڑ بیس لاکھ دن شمار کرلیں۔

اب چونکہ سرمایہ دار اور مزدور کو اسی ایک محدود ویلیو میں سانجھا کرنا ہے، یعنی وہی ویلیو بانٹنی ہے جس کا ناپ ہوتا ہے مزدور کی پوری محنت سے، اس لیے دونوں میں سے ایک کو جتنا زیادہ ملے گا دوسرے کو اتنا ہی کم ہاتھ آئے گا یا اس کے برعکس۔ اگر ایک مقررہ مقدار ہو تو اس کا ایک حصہ جتنا بڑھے گا دوسرا حصہ اسی نسبت سے گھٹے گا۔ اگر اجرتوں میں تبدیلی ہو تو منافع میں الٹی طرف تبدیلی ہوگی۔ اجرت کم ہوگی تو منافع بڑھے گا، اور اجرت بڑھے گی تو منافع گھٹے گا۔ جیسا کہ ہم نے فرض کیا تھا اگر مزدور کو تین شلنگ ملتے ہیں تو جو ویلیو اس نے پیدا کی یہ اس کے آدھے کے برابر ہے، یا اس کی محنت کا پورا دن آدھی معاوضہ والی اور آدھی بے معاوضہ محنت میں جاتا ہے تو شرح منافع سو فیصدی ہوئی کیونکہ سرمایہ دار کو بھی تین ہی شلنگ ملنے والے ہیں۔ اگر مزدور کو صرف دو شلنگ ملے، یعنی دن بھر کی صرف تہائی محنت اپنی ذات کے لیے استعمال کی تو سرمایہ دار کو چار شلنگ ملیں گے اور شرح منافع ہوگی دو سو فیصدی۔ اگر مزدور کو چار شلنگ ملے تو سرمایہ دار کے ہاتھ صرف دو شلنگ آئیں گے اور شرح منافع پچاس فیصدی رہ جائے گی۔ یہ اونچ نیچ جتنی ہوتی رہے اس سے مال کی ویلیو پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس لئے اجرتوں میں عام اضافے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام

شرح منافع گر جائے لیکن اس کا قدروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اگر چہ مالوں کی یہ قدریں جو آخر میں جا کر ان کے بازار دام گھٹاتی بڑھاتی ہیں، قطعی طور پر طے پاتی ہیں محنت کی اس پوری مقدار سے ہی جو ان مالوں کی اندر لگی ہوئی ہو، اور اس سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں کہ کتنی محنت کا معاوضہ ادا ہو، کتنی بے معاوضہ رہی، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کسی ایک مال یا کئی مالوں کی ویلیو جو مثلاً بارہ گھنٹے میں تیار ہوئی ہے وہ ایک ہی حال پر قائم رہتی ہے۔ محنت کے ایک مقررہ وقت یا ایک مقررہ مقدار میں مالوں کی جتنی تعداد یا کھیپ بن کر تیار ہوتی ہے اس کا انحصار ہے لگی ہوئی محنت کی قوت پیداوار پر۔ اس پر نہیں کہ کتنا وقت محنت لگا۔ مثال کے طور پر کتائی کے کام میں ایک تو اس درجے کی وقت پیداوار والی محنت ہو سکتی ہے کہ بارہ گھنٹے کے کام سے سے بارہ پونڈ دھاگا تیار کر دے اور کچھ کم درجے کی قوت پیداوار والی محنت اتنی دیر میں صرف دو پونڈ تیار کر سکے۔ اب اگر بارہ گھنٹے کی اوسط محنت چھ شلنگ کی ویلیو میں وصول ہوتی ہے تو ایک موقع پر بارہ پونڈ دھاگے کی قیمت چھ شلنگ ہو گی اور دوسرے موقع پر دو پونڈ دھاگے کی لاگت بھی چھ شلنگ آئے گی۔ اس لئے ایک جگہ تو ایک پونڈ دھاگا کا چھ پینس کا پڑا اور دوسری جگہ تین شلنگ کا۔ قیمت کا یہ فرق نتیجہ ہے اس بات کا کہ جو محنت لگی تھی اس کی قوت پیداوار میں فرق تھا۔ محنت کا ایک گھنٹہ، اگر قوت پیداوار کم ہو تو محنت کے چھ گھنٹے سے ایک پونڈ دھاگا وصول ہو گا۔ چنانچہ ایک موقع پر تو ایک پونڈ دھاگے کی قیمت صرف چھ پینس ہو گی چاہے اجرت نسبتاً زیادہ ہو اور شرح منافع کم۔ اور دوسرے موقع پر اتنے ہی دھاگے کی قیمت تین شلنگ ہو گی، چاہے اجرت کم ہو اور شرح منافع زیادہ۔ وجہ اس کی یہ کہ ایک پونڈ دھاگے کی قیمت محنت کی اس پوری مقدار سے ہی گھٹتی بڑھتی ہے جو

اس کی تیاری میں لگ چکی ہے، محنت کی وہ پوری مقدار معاوضہ والی اور بے معاوضہ محنت میں چاہے کسی نسبت سے تقسیم ہوتی رہے۔ وہ حقیقت جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ زیادہ داموں والی محنت کم قیمت مال تیار کر سکتی ہے اور کم دام والی محنت مہنگا مال، اب اس بیان میں کوئی قول محال نظر نہیں آئے گا۔ اس میں محض ایک عام اصول پیش کیا گیا تھا کہ کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار کے مطابق رہتی ہے جو اس مال میں لگی ہو، اور محنت کی مقدار کے مطابق رہتی ہے جو اس مال میں لگی ہو، اور محنت کی مقدار لے کر منحصر ہے لگی ہوئی محنت کی قوت پیداوار پر چنانچہ محنت کی پیداواری قوت کے ہر ایک فرق کے ساتھ اس میں بھی فرق پڑے گا۔

13۔ وہ خاص موقع جب اجرت کو بڑھانے یا اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اب ہمیں سنجیدگی سے ان موقعوں پر غور کرنا چاہئے جہاں یا تو اجرت بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے یا سے گرنے سے روکنے کے لئے مقابلی کیا جاتا ہے۔

1۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قوت محنت کی ویلیو یا عام لفظوں میں محنت کی ویلیو ضروریات زندگی کی ویلیو سے طے پاتی ہے یا محنت کی اس مقدار سے طے پاتی ہے جسے ان ضروریات کی تیاری میں لگانا پڑے۔ اب اگر کسی ملک میں مزدور کی روزمرہ اوسط ضروریات کی ویلیو چھ گھنٹے کی محنت کے برابر ہے جو تین شلنگ میں ظاہر ہوتی ہے تو مزدور کو چھ گھنٹے روز کام کرنا ہوگا تا کہ وہ روز کی گزر اوقت کے مساوی پیدا کر سکے۔ اور اگر کام کا پورا دن بارہ گھنٹے کا ہو تو سرمایہ دار اس کی محنت کی ویلیو تین شلنگ میں ادا کرے گا۔ کام کا آدھا دن بے معاوضہ جائے گا اور شرح منافع ٹھیرے گی سو فیصدی۔ لیکن آگے فرض کیجئے کہ قوت پیداوار کم ہونے کے باعث، یوں کہیے کہ

زرعی پیداوار کی اتنی ہی مقدار اٹھانے کے لئے محنت کی زیادہ مقدار چاہئے۔ اور اس کے سبب روزمرہ اوسط ضروریات کی قیمت تین سے بڑھ کر چار شلنگ ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں محنت کی ویلیو ایک تہائی بڑھ گئی۔ پہلے کے معیار زندگی سے مزدور کی روز کی گزراوقات کے مساوی پیدا کرنے کے لئے اب کام کے آٹھ گھنٹے لگانے ضروری ہو جائیں گے چنانچہ زائد یا فالتو محنت چھ سے چار گھنٹے ہی رہ جائے گی اور شرح منافع سو سے گھٹ کر 50 فیصدی پر آجائے گی۔ اپنی اجرت بڑھوانے کے لئے مزدور جب زور دے گا تو وہ اصرار کرے گا محض اس بات پر کہ اس کی محنت کی بڑھی ہوئی ویلیو ادا کی جائے جیسا کہ کوئی بھی مال بیچنے والا، جس کے مال کی لاگت بڑھ چکی ہو، اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کے مال کی بڑھی ہوئی ویلیو ادا کی جائے۔ اگر اجرت نہیں بڑھتی یا تسلی بخش حد تک نہیں بڑھتی کہ ضروریات زندگی کی بڑھی ہوئی ویلیو کو پوری بڑھ سکے تو محنت کی قیمت اس کی ویلیو سے نیچے اتر جائے گی اور مزدور کا معیار زندگی بگڑ جائے گا۔

مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تبدیلی مخالف سمت میں ہو۔ محنت کی قوت پیداوار بڑھی ہونے کی بدولت روزمرہ اوسط ضروریات کی اتنی ہی مقدار ممکن ہے کہ تین شلنگ کے بجائے دو شلنگ پر اتر آئے یا یوں کہئے کہ کام کے دن میں چھ میں بجائے صرف چار گھنٹے کافی ہونے لگیں روزمرہ ضروریات کی ویلیو کے مساوی پیدا کرنے کو۔ اب محنت کرنے والا دو شلنگ میں ہی اتنی ضروریات خرید سکے گا جتنی وہ تین شلنگ میں خریدا کرتا تھا۔ محنت کی ویلیو بے شک گری لیکن وہ گری ہوئی ویلیو مال کی اتنی ہی مقدار پر حاوی ہے جتنی پہلے تھی۔ ایسی حالت میں منافع تین سے چار شلنگ ہو جائے گا اور شرح منافع سو سے دو سو فیصدی۔ اگر چہ مزدور کا قطعی معیار زندگی

جہاں تھا وہیں رہا لیکن اس کی نسبتی اجرت اور ساتھ میں اس کی نسبتی سماجی حیثیت سرمایہ دار کے مقابلے میں اور گر گئی۔ اب اگر کام کرنے والا نسبتی اجرت کو اور گرنے سے روکنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ صرف اسی کوشش میں ہے کہ خود اپنی محنت کی بڑھی ہوئی قوت پیداوار میں کچھ حصہ بٹائے اور سماجی پیمانے پر اپنی پہلے کی نسبتی حیثیت کو سنبھالے رکھے۔ چناں چہ جب انگلینڈ میں اناج کا قانون منسوخ کیا گیا اور اس قانون کے منسوخ کرانے کے ایجی ٹیشن کے دنوں میں جو حلفیہ وعدے کئے گئے تھے ان کی کھلی خلاف ورزی کر کے انگریز مل مالکوں نے عام طور سے اجرتیں دس فیصدی گھٹا دیں تو مزدوروں نے ٹکر لی۔ شروع میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ لاحاصل رہی۔ لیکن بعد میں کچھ ایسے اسباب کی بدولت جن کا بیان میں فی الحال نہیں کر سکتا، وہ کٹی ہوئی دس فیصدی اجرت پھر وصول کر لی گئی۔

2۔ ضروریات زندگی کی ویلیو ممکن ہے وہی رہے جو تھی اور اس کے نتیجے میں محنت کی ویلیو بھی وہی رہے، لیکن ان کی نقد قیمت میں فرق آ جائے کیوں کہ روپے کی ویلیو پہلے بدل چکی۔

مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ زرخیز کانیں دریافت ہونے یا کسی اور وجہ سے دو اونس سونا حاصل کرنے کی محنت اتنی ہی رہ جائے جتنی پہلے ایک اونس سونے میں لگتی تھی۔ اس صورت میں سونے کی ویلیو گھٹ کر آدھی یا پچاس فیصدی رہ جائے گی۔ اب چونکہ تمام مالوں کی ویلیو پہلے سے دوگنی رقم میں ظاہر کی جائے گی تو محنت کی ویلیو کا بھی یہی ہو گا۔ بارہ گھنٹے کی محنت جو پہلے چھ شلنگ میں ظاہر ہوتی تھی اب بارہ شلنگ میں ہونے کے بجائے اب بھی تین ہی شلنگ رہی تو اس کی محنت کی نقد قیمت محنت کی ویلیو سے آدھی رہ جائے گی اور اس کا معیار زندگی بہت بری طرح گرے گا۔

اگر اس کی اجرت بڑھ بھی جائے لیکن اس تناسب سے نہ بڑھے جس سے سونے کی ویلیوگری ہے تب بھی محنت کی نقد ویلیوگرنا کم وبیش ویسا ہی رہے گا۔ایسے موقع پر اور کچھ نہیں بدلا۔محنت کی پیداواری قوت، مانگ اور سپلائی یا مالوں کی قدریں سب جوں کی توں رہیں۔انقدروں کے نام جونقد رقموں کی صورت میں ہوتے ہیں، ان کے سوا کوئی شے تبدیل نہیں ہوئی۔یہ کہنا کہ اس صورت میں مزدور اپنی اجرت میں بقدر مناسب اضافی کی کوشش نہ کرے، ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ چیزوں کے جنائے وہ صرف ناموں میں معاوضہ لے کر قناعت اختیار کرے۔پچھلی تمام تاریخ ثابت کرتی ہے کہ جب بھی نقد رقم کی قیمت گرنے کا موقع آتا ہے تو سرمایہ دار چوکنے ہو جاتے ہیں اور موقع سے فائدہ اٹھا کر محنت کرنے والوں کو فریب دئے رہتے ہیں۔سیاسی معاشیات کے ماہرین ک ایک بڑا مکتب فکر ایسا ہے جس کا کہنا ہے کہ سونے والی زمینوں کی نئی دریافتوں کی بدولت، چاندی کی کانوں میں کام کی آسانیوں، اور پارے کی سستی نکاسی کی بدولت قیمتی دھاتوں کی ویلیو پھر گر گئی ہے۔ اس سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یورپ میں ہر طرف اور ایک ساتھ کیوں آواز اٹھی ہے اجرتیں بڑھوانے کی۔

3۔اب تک عام طور سے م یہ فرض کرنے ائے ہیں کہ کام کا دن محدود ہوتا ہے۔کچھ بھی سہی کام کا دن بجائے خود مستقل حدوں کا پابند نہیں۔سرمائے کا مستقل رجحان یہی ہے کہ اسی حساب سے فالتو محنت لے گا اور اس سے حاصل ہونے والا منافع بھی اتنا ہی بڑھے گا۔کام کے دن کو لمبا کھینچنے میں سرمائے کو کس قدر کامیابی ہو گی اسی قدر وہ دوسروں کی محنت ہتھیا سکے گا۔سترہویں صدی میں، بلکہ اٹھارویں صدی کے پہلے دو تہائی حصوں میں بھی پورے انگلستان میں کام کے دس گھنٹے کا

معمول تھا۔ جیکو بین کے خلاف جنگ چھڑی جو دراصل برطانوی امیروں نے برطانیہ کے عام مزدوروں کے خلاف چھیڑی تھی (23) تو لڑائی کے پورے عرصے سرمائے نے خوب بغلیں بجائیں اور کام کا دن دس کے بجائے بارہ، چودہ اور اٹھارہ گھنٹے تک بڑھا دیا۔ مالتھوس، جسے دور دور جذباتی رقت کا الزام نہیں دیا جا سکتا، 1815 کے شائع شدہ ایک پمفلٹ میں کہتا ہے کہ اگر یہی حالت چلتی رہی تو قوم کی زندگی کی خاص جڑ بنیاد پر چوٹ پڑے گی (24)۔ نو ایجاد مشینری ابھی عام طور سے لگائی نہ گئی تھی کہ اس سے چند سال پہلے 1765 کے قریب انگلینڈ میں ایک پمفلٹ شائع ہوا جس کا عنوان تھا: "صنعت پر ایک مضمون"۔ پمفلٹ کا بے نام مصنف، جو محنت کش طبقوں کا پکا دشمن ہے (غالباً اس کا مصنف تھا جان کنتگھم)۔، کھلے لفظوں میں زور دے کر کہتا ہے کہ محنت کے دن کی حدیں پھیلانا بے حد ضروری ہے۔ اس مقصد سے اور باتوں کے علاوہ وہ ایک تجویز یہ بھی رکھتا ہے کہ محنت کے دن کی حدیں پھیلانا بے حد ضروری ہے۔ اس مقصد سے اور باتوں کے علاوہ وہ ایک تجویز یہ بھی رکھتا ہے کہ محنت گھر (25) قائم کئے جائیں جو بقول اس کے "ہیبت گھر" ہونے چاہئیں۔ ان "ہیبت گھروں" کے لئے محنت کے دن کی حدیں کیا ہوں گی؟ وہ بارہ گھنٹے کی تجویز کرتا ہے، یعنی ٹھیک اتنا وقت جتنا 1832 میں سرمایہ داروں، سیاسی معاشیات والوں اور وزیروں کے کہنے کے مطابق نہ صرف اس زمانے میں مقرر تھا بلکہ محنت کے لئے کم از کم اتنا ضروری اور بارہ برس تک کی عمر کے بچے پر بھی لازم ہونا چاہئے۔

اپنی قوت محنت بیچ کر، موجودہ نظام میں اسے بیچنا تو ہے ہی، مزدور اس قوت کا استعمال سرمایہ دار کے سپرد کر دیتا ہے لیکن چند معقول حدوں کے اندر۔ وہ اپنی قوت

محنت بیچتا ہے تا کہ اسے سنبھال سکے (قدرتی طور پر جتنی گھسائی ہوتی ہے فی الحال اس کا ہم حساب نہیں کرتے) لیکن وہ بالکل ہی برباد ہونے پائے۔ روز کی یا ہفتہ وار ویلیو کے حساب سے اپنی قوت محنت بیچنے میں یہ بات ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ ایک دن یا ایک ہفتے کے اندر وہ قوت محنت دو دن یا دو ہفتے کے برابر نہ تو خرچ کی جائے گی، نہ اتنی ضائع ہونے پائے گی کوئی مشین لیجئے جس کی قیمت ایک ہزار پونڈ ہے۔ اگر وہ دس سال کے استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوتی ہے تو جو مال اس سے بنایا جاتا ہے، اس مال میں ہر سال ایک سو پونڈ کی ویلیو کا اضافہ کرے گی۔ اور اگر اسے صرف پانچ سال کے استعمال میں ختم ہونا ہے تو سالانہ دو سو پونڈ کی ویلیو لگے گی، یا یوں کہیں کہ مشین کی سالانہ گھسائی کی ویلیو اتنے عرصے پر پھیلائی جاتی ہے جتنے عرصے میں وہ استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گی۔ مگر یہاں آدمی اور مشین مین فرق پڑتا ہے۔ مشین کی طاقت ٹھیک اسی نسبت سے ختم نہیں ہوتی جس سے اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف آدمی پر کام کے اوقات بڑھائے جاتے ہیں تو وہ دیکھنے میں جتنا تھکتا ہے، درحقیقت اس سے زیادہ ٹوٹتا یا گھل جاتا ہے۔

جب محنت کرنے والوں کی طرف سے یہ کوشش کی جائے کہ کام کے گھنٹے پہلے کی معقول حدوں تک کم ہوں، یا یہ کہ جب وہ کام کے گھنٹوں کے معمول پر قانونی حد نہیں لگوا سکتے تو اجرت بڑھوا کر کام کی زیادتی پر ایک روک لگانے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی فالتو وقت میں جو ان سے کام لیا گیا اجرت اسی کی نسبت سے نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بڑھائی جائے (یا اوور ٹائم کی اجرت نسبتاً زیادہ ہو) تو وہ صرف اپنی طرف سے اور اپنی نسل کی طرف سے ایک فرض ادا کرتے ہیں۔ محنت کرنے والے اس طرح صرف حدیں کھڑی کرتے ہیں سرمائے کے بے درد قبضہ مخالفانہ

پر۔وقت انسانی نشوونما کے لئے محض ایک گنجائش ہی تو ہے۔جس آدمی کو فرصت کا وقت میسر نہ ہو،جس کی ساری عمر،سونے،کھانے وغیرہ کی جسمانی حاجتوں کو چھوڑ کر باقی تمام وقت سرمایہ دار کے لئے محنت کرنے میں کٹ جائے،وہ لداؤ جانور سے بھی بدتر زندگی گزارتا ہے۔جسمانی لحاظ سے تھکا ہارا اور روحانی لحاظ سے بے حس، وہ ایک ایسی مشین رہ جاتا ہے جس سے غیر کی دولت ڈھالی جائے۔پھر بھی موجودہ صنعت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ اگر سرمائے پر پابندی نہ لگائی جائے تو وہ بڑی بے پروائی اور بے رحمی کے ساتھ پورے محنت کش طبقے کو انتہائی پستی کی حالت پر پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔

کام کے گھنٹے بڑھانے میں سرمایہ دار زیادہ اجرت دیتے ہوئے بھی محنت کی ویلیو گرا سکتا ہے،اگر وہ اجرت، جو بڑھائی گئی ہے،محنت کی اس بڑھتی ہوئی مقدار سے،جو مزدور سے لی جاتی ہے،اور زیادہ محنت کی وجہ سے قوت محنت میں جو تیزی سے زوال آتا ہے،اس سے بھی میل نہ کھاتی ہو۔ایک اور ترکیب بھی ہے۔آپ کے یہ اعداد شمار نکالنے والے جو درمیانی طبقے سے ہونے ہیں،بتائیں گے کہ مثلاً لنکا شائر میں فیکٹری کے ملازم خاندانوں کی اوسط اجرتیں بڑھ گئی ہیں۔وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جہاں پہلے صرف ایک آدمی یعنی خاندان کا بڑا کام کیا کرتا تھا،اب وہیں اس کی بیوی اور تین چار بچے بھی سرمائے کے جگن ناتھ کے رتھ کے نیچے (26 پسنے کو ڈال دئے گئے ہیں اور ان کی اجرت مل کر جتنی بڑھی ہے وہ اس فالتو محنت کے برابر نہیں آتی جو سارے خاندان سے ملا کر لی جاتی ہے۔

اگر کام کے گھنٹوں کی مقررہ حد بھی قائم رہے جیسا کہ آجکل صنعت کی ان تمام شاخوں میں ہے جو فیکٹری قانون کے ماتحت ہیں،تب بھی اجرت کا بڑھنا محنت کی

ویلیو کی ادائیگی کا وہی پچھلا معیار قائم رکھنے کی خاطر ضروری ہو جاتا ہے۔ محنت کی شدت بڑھانے سے، یہ ممکن ہے کہ آدمی کو گھنٹے بھر کے وقت میں اتنی محنت خرچ کرنی پڑ جائے جتنی وہ پہلے دو گھنٹے میں کیا کرتا تھا۔ صنعت کی ان شاخوں میں جن پر فیکٹری کا قانون لاگو ہے، کسی حد تک یہ عمل ہو بھی چکا ہے اور وہ اس طرح کہ مشینری اور کام کی رفتار تیز کر کے ایک ایک آدمی کے ذمے زیادہ مشینوں کی دیکھ بھال کر دی گئی۔ اگر محنت کی شدت بڑھانے یا ایک گھنٹے میں جتنی محنت کھپتی ہے اسے بڑھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کرتا کہ کام کے گھنٹوں کی مدت بجا طور پر کم کر دی جاتی تب بھی محنت کرنے والا کچھ فائدے میں رہتا ہے۔ اگر وقت محنت کی یہ حد ٹوٹتی ہے تو اس نے ایک شکل میں جو پایا وہ دوسری صورت میں کھو دیا، اور دس گھنٹے کی محنت اتنی ہی جان لیوا بن جائے گی جتنی بارہ گھنٹے کی محنت بنی ہوئے تھی۔ سرمائے کے اس رجحان پر روک لگانے میں جب مزدور کی طرف سے کوشش ہوتی ہے کہ محنت کی بڑھتی ہوئی شدت کے مطابق ہی اس کی اجرت بھی بڑھائی جائے تو وہ صرف اتنا کرتا ہے کہ اپنی محنت کی قیمت گرنے اور اپنی نسل پر زوال آنے کا توڑ کرے۔

4۔ آپ سب واقف ہیں کہ ایسی وجہوں سے جن کی تفصیل یہاں کچھ ضروری نہیں، سرمایہ دارانہ پیداوار تھوڑے تھوڑے وقفے سے بعض چکروں سے گزرتی رہتی ہے۔ ایک حالت امن چین کی ہوتی ہے، پھر بڑھتی ہوئی ہلچل، خوشکالی، ضرورت سے زیادہ پیداوار، بحران یا سنکٹ اور پھر جمود۔ مال کے بازار دام اور بازار کی شرح منافع کو بھی انھی دوروں سے گزرنا پڑتا ہے کہ کبھی اوسط سے گرے، کبھی بڑھ گئے۔ اگر اس پورے چکر پر نظر رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ بازار دام اگر ایک طرف کو زیادہ ہٹتے ہیں تو پھر دوسری طرف ہٹ کر اپنا حساب برابر کر لیتے ہیں اور پورے چکر

کا اوسط نکالا جائے تو مالوں کے بازار دام بالآخر اپنی ویلیو کے ہی پابند رہتے ہیں۔ اچھا تو بازار دام ڈوبنے کے دور میں، بحران اور جمود کے دنوں میں اگر محنت کرنے والے کو بالکل ہی بے روزگار نہ کر دیا جائے تو اس کی اجرت ضرور گھٹا دی جاتی ہے۔ دام گرتے وقت بھی، فریب سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ محنت کرنے والا سرمایہ دار سے مول تول کرے کہ اجرت گھٹایا جانا

ضروری ہے تو کس تناسب سے ضروری ہے۔ اور خوش حالی کے زمانے میں جب خاص کر زائد منافع بن رہا ہو، اگر وہ اپنی اجرت بڑھوانے کے لئے نہیں لڑے تو صنعتی رفتار کا ایک چکر پورا ہوتے ہوتے جو اوسط پڑے گا اس میں اوسط اجرت یا اپنی محنت کی ویلیو بھی نصیب نہیں ہوگی۔ حماقت کی انتہا ہوگی اگر یہ تقاضہ کیا جائے کہ صنعتی چکر کے برے دنوں کا اجرت پر برا اثر تو ضرور ہی پڑے گا لیکن، جب اچھے دن ہوں، تو خوش فہمی میں رہنے سے مزدور خود کو علیحدہ ہی رکھے۔ عموماً تمام مالوں کی قدریں صرف اسی طرح وصول ہوتی ہیں کہ مانگ اور سپلائی کی لگاتار اونچ نیچ ہوتے رہنے سے بازار دام اپنی کمی بیشی کا حساب برابر کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ نظام کے اصول سے محنت بھی اوروں کی طرح ایک مال ہے۔ چنانچہ اسے بھی کمی بیشی سے گزرنا چاہئے تاکہ اپنی ویلیو کے مناسب اوسط قیمت حاصل کر سکے۔ یہ ایک احمقانہ بات ہے کہ ایک طرف تو محنت کو ایک مال شمار کیا جائے اور دوسری طرف مال کی قیمتوں پر جو اصول لاگو ہوتے ہیں ان سے محنت کو الگ رکھا جائے۔ غلام کو گزارا اوقات کے لئے ایک مقررہ اور مستقل طلب ملتی رہتی لیکن اجرت پر کام کرنے والے کو نہیں ملتی۔ پس لازم ہے کہ وہ ایک موقع پر اپنی اجرت بڑھوانے کی کوشش کرے تاکہ اور کچھ نہیں تو دوسرے موقع پر اجرت گھٹنے کی تلافی ہو جائے۔ اگر وہ

ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور سرمایہ دار کی مرضی اور حکم کو ہی مستقل معاشی قانون سمجھ کر قبول کر لے تو وہ غلاموں کی سی بدنصیبی کا شکار تو ہو جائے گا، غلام کی سی بے فکری اسے نصیب نہ ہو گی۔

5۔ اب تک جتنی مثالیں میرے زیر غور آئی ہیں اور ان کی تعداد سو میں ننانوے ضرور ہے، آپ نے دیکھ لیا کہ اجرت بڑھوانے کی جدوجہد اپنے سے پہلے کی تبدیلیوں کی لپیٹ میں قدم بقدم چلتی ہے اور یہ خمیازہ ہے ان پہلے کی پیداواری طاقت میں، محنت کی ویلیو میں، روپے کی ویلیو میں، جو محنت لی جاتی ہے اس کی گنجائش یا شدت میں، قیمتوں کی اس اونچ نیچ میں جو منحصر ہے مانگ اور سپلائی کی کمی پیشی پر، اور صنعتی رفتار کے پورے چکر کے مختلف مرحلوں سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ اجرت بڑھوانے کی مانگ لیبر کی جوابی کاروائی ہے سرمائے کی پہلے سے کی ہوئی کاروائی پر۔ اس جدوجہد کو ان تمام حالات سے بے تعلق کر کے دیکھنا، صرف اجرت کی تبدیلی پر نظر رکھنا اور ان تمام تبدیلیوں سے نظر بچا جانا جن سے یہ تقاضہ پیدا ہوتا ہے، ایسا ہے کہ آپ ایک غلط مفروضے سے شروع کرتے ہیں تا کہ آخر میں غلط نتیجے پر پہنچ جائیں۔

14۔ سرمائے اور محنت کی شکش اور اس کے نتیجے

1۔ میں دکھا چکا ہوں کہ اجرت گھٹائے جانے کے خلاف مزدوروں کی طرف سے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مقابلہ کیا جاتا ہے اور بار بار کوشش کی جاتی ہے کہ اجرت بڑھے، یہ بات اس اجرتی نظام کے ساتھ لازم ملزوم ہے اور خود اٹھتی بھی ہے اسی وجہ سے کہ محنت کو مال کا درجہ حاصل ہے، اس لئے وہی قاعدے جو قیمتوں کی عام رفتار پر حاوی رہتے ہیں، محنت بھی انھی کی پابند ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی

دتھا چکا ہوں کہ اجرت میں عام اضافے کا اثر یہی ہوتا ہے کہ شرح منافع عام طور سے گھٹ جائے، پھر بھی اس سے مالوں کی اوسط قیمتوں پر یا ان کی قدروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تو آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمائے اور محنت کی اس مسلسل کش مکش میں محنت کی کامیابی کے آثار کہاں تک ہیں۔

کلیے کی صورت میں تو یہ جواب دے سکتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ جیسا اور مالوں کا معاملہ ہے ویسا ہی محنت کا بھی ہے کہ اس کے بازار دام بھی ایک بڑے عرصے کے اندر اپنی ویلیو سے تال میل پیدا کریں گے۔ لہذا چاہے کتنے ہی نشیب و فراز آتے رہیں اور مزدور کچھ بھی کرے، اوسط میں اسے وہی وصول ہوگی جو اس کی محنت کی ویلیو یا جو اس کی قوت محنت کی ویلیو بنتی ہے، اور وہ طے پاتی ہے ان ضروریات کی ویلیو سے جو محنت کو قائم رکھنے اور پھر سے پیدا کرنے کے لئے لازم ہیں۔ یہ ضروریات زندگی کی ویلیو کم وبیش ہوتی رہتی ہے محنت کی اس مقدار سے جو ان چیزوں کے تیار کرنے میں لگتی ہے۔

لیکن بعض خصوصیات ایسی ہیں جو قوت محنت کی یا خود محنت کی ویلیو کو دوسرے تمام مالوں کی قدروں سے امتیاز بخشتی ہیں۔ قوت محنت کی ویلیو دو عناصر سے بنتی ہے: ایک محض جسمانی، سو سرا تاریخی یا سماجی۔ اس کی سب سے نچلی حد تو جسمانی عنصر سے ہی بنتی ہے، یا یوں کہئے کہ اپنا وجود باقی رکھنے اور پھر سے پیدا کرنے کی خاطر، اپنے جسمانی وجود کو قائم و دائم رکھنے کی خاطر مزدور طبقے کو وہ ضروریات زندگی میسر ہونی چاہیں جو زندہ رہنے اور نسل بڑھانے کے لیے انتہائی لازمی ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہی انتہائی لازمی ضروریات زندگی کی جو ویلیو ہوگی وہی محنت کی ویلیو کی کم از کم حد مقرر ہوگی۔ دوسری طرف دیکھئے تو کام کے دن کے پھیلاؤ پر بھی کوئی نہ کوئی آخر

ی حد ضرور ہوتی ہے، چاہے اس میں کتنی ہی لوچ اور لچک ہو۔ محنت کرنے والے کی جسمانی طاقت ہی اس کی آخری حد بنا دیتی ہے۔ اگر اس کے بدن کی اصلی سکت روزانہ کی کسی حد سے زیادہ خرچ ہونے لگے تو ہر روز نئے سرے سے اتنی ہی نہیں کھپائی جا سکتی۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اس حد میں بڑی لچک ہوتی ہے۔ اگر کمزور اور کم جینے والی نسلیں یکے بعد دیگرے جلدی جلدی آتی رہیں تو بھی لیبر کے بازار کو اسی طرح بھرا رکھیں گی جیسے مضبوط جسم کی اور زیادہ عمر پانے والی نسلوں کا سلسلہ رکھتا۔

اس جسمانی عنصر کے علاوہ محنت کی ویلیو ہر ایک ملک میں وہاں کے پہلے سے چلتے ہوتے معیار زندگی سے طے پاتی ہے۔ یہ صرف جسمانی زندگی کی بات نہیں، بلکہ ایسی ضروریات کا مہیا کرنا بھی شامل ہے کہ جن سماجی حالات میں لوگ پلتے بڑھتے ہیں یہ ضروریات بھی انہی سے ابھرتی ہیں۔ انگریز کا معیار زندگی آئرلینڈ کے معیار تک گھٹایا جا سکتا ہے۔ کسی جرمن کسان کا معیار زندگی لیوونیا والے کسان تک اتارا جا سکتا ہے۔ تاریخی رواج اور سماجی چلن اس سلسلے میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں، یہ آپ مسٹر تھارن ٹن کی تصنیف ''حد سے زیادہ آبادی پر'' دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں، جہاں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ انگلینڈ کے مختلف زراعتی ضلعوں میں آج بھی اوسط اجرت مختلف ہے۔ یہ ضلعے زمین سے بندھے (نیم غلام) کسان حالت سے نکل کر سدھار کے جس جس درجے میں پہنچ پاتے ہیں، اسی درجے کی کم وبیش نسبت سے ان کی اجرتوں میں فرق پڑتا ہے۔

یہ تاریخی یا سماجی عنصر جو محنت کی ویلیو میں دخیل ہوتا ہے، زیادہ پھیل بھی سکتا ہے، سکڑ بھی سکتا ہے، یہاں تک کہ بالکل ناپید بھی ہو سکتا ہے کہ سوائے جسمانی

حد کے اور کچھ نہ رہ جائے۔ جس زمانے میں جیکوبی کے خلاف جنگ چل رہی تھی (بڑے میں جارج روز، جو ٹیکس ہضم کرنے کے پرانے پاپی اور مفت کی تنخواہ پانے کے عادی (Sinecurist) تھے اس جنگ کا مقصد یوں بتایا کرتے تھے کہ یہ ہمارے مقدس مذہب کی خوبیوں کو فرانسیسی بے دینوں کی دست برد سے بچانے کی خاطر ہے) ان دنوں دیندار انگریز کاشتکار نے، جس کا ذکر خیر ہم پہلے کسی موقع پر کر چکے ہیں، زرعی مزدوروں کی اجرتیں گھٹاتے گھٹاتے اتنی کر دیں تھیں کہ خالص جسمانی احتیاج کو بھی کم پڑنے لگیں، اور وہ ضرورت جو نسل کو باقی اور جاری رکھنے کیلئے درکار تھیں، ان کی کمی پوری کی جاتی اس فنڈ سے جو" قانون مفلسی" (27) کی رو سے مقرر تھا۔ یہ شاندار ترکیب اس مقصد کے لئے تھی کہ اجرت پر کام کرنے والے کو غلام بنا کر اور شیکسپیر کے پیش کئے ہوئے بانکے کو مفلس قلاش بنا کر رکھ دیا جائے۔

اگر آپ مختلف ملکوں میں یا کسی ایک ہی ملک کے مختلف تاریخی دوروں میں اجرتوں کے معیار یا محنت کی قدروں کا موازنہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ خود محنت کی ویلیو بھی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ جس وقت اور دوسرے مالوں کی قدریں ایک حالت پر قائم ہوں تب بھی محنت کی ویلیو برابر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

اس طرح کا موازنہ کرنے سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ منافع کے صرف بازار بھاؤ ہی نہیں ملتے بلکہ اس کا اوسط بھاؤ بھی بدل جاتا ہے

تاہم منافع کے معاملے میں کوئی ایسا اصول یا قاعدہ نہیں جو اس کی کم از کم حد مقرر کرتا ہو۔ کہا نہیں جا سکتا کہ منافع آخر میں کہاں تک اتر سکتا ہے۔ یہ حد مقرر کیوں نہیں جا سکتی؟ کیوں کہ اجرت کم از کم حد تو مقرر کر دی جائے لیکن اس کی زیادہ

سے زیادہ حد نہیں ٹھیرائی جا سکتی۔ ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کام گھنٹے دئے ہوئے ہوں تو زیادہ سے زیادہ منافع ٹھیرے گا جہاں اجرت کی کم از کم جسمانی سطح ہوگی، اور اجرتیں دی ہوئی ہوں تو زیادہ سے زیادہ منافع کام کے گھنٹوں کی اس گنجائش سے میل کھائے گا جسے مزدور کی جسمانی طاقت سہار سکے۔ مطلب یہ کہ زیادہ سے زیادہ منافع ان حدوں کے درمیان پہنچ کر ٹھیرتا ہے جہاں اجرتیں کم از کم اتری ہوئی ہوں (Physical minimum of wages) اور کام کے گھنٹے زیادہ سے زیادہ بڑھے ہوتے ہوں (Physical maximum of the working days)۔ ظاہر بات ہے کہ زیادہ سے زیادہ شرح منافع کی ان دو حدوں کے درمیان اونچ نیچ کی بے پناہ صورتیں بھی ممکن ہیں۔ واقعی کس درجے پر لا کر منافع ٹھہرایا جائے، یہ طے پاتا ہے صرف اس کش مکش سے جو محنت اور سرمائے کے درمیان مستقل چلتی رہتی ہے۔ سرمایہ دار برابر اس کوشش میں رہتا ہے کہ اجرتیں گھٹا کر سب سے نیچی جسمانی سطح پر لائی جائیں اور کام کے گھنٹے بڑھا کر سب سے اوپر کی جسمانی سطح تک پہنچائے جائیں، اس پر محنت کرنے والا لگاتار مخالف سمت میں زور ڈالتا رہتا ہے۔

آخر یہ معاملہ حریفوں کی زور آزمائی کا ایک سوال بن کر رہ جاتا ہے۔

2- جہاں تک کام کے گھنٹوں کی حد بندی کا مسئلہ ہے، وہ انگلینڈ میں ہوں یا دوسرے ملکوں میں، کبھی طے نہیں ہو سکا سوائے اس کے کہ قانون سازی نے دخل دے کر طے کرایا۔ اگر مزدور باہر سے برابر دباؤ نہ ڈالتے رہتے تو قانون بھی کبھی دخل دینے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اور جو بھی ہوتا لیکن اس نتیجے پر کبھی نہیں پہنچا جا سکتا تھا کہ محنت کرنے والے اور سرمایہ دار آپس میں نبٹ لیں اور کام کے گھنٹوں کی حد

بندی طے کرلیں۔ عام سیاسی کاروائی کی ضرورت پڑنا خود ہی ثبوت دیتا ہے کہ اگر معاملہ صرف معاشی کاروائی کا ہوتو سرمایہ زیادہ مضبوط فریق ہے۔

رہا محنت کی ویلیو کی حدوں کا سوال تو اس کا صحیح فیصلہ صرف مانگ اور سپلائی پر منحصر رہتا ھے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ سرمائے کی طرف سے لیبر کی مانگ اور محنت کرنے والوں کی طرف سے لیبر کی سپلائی۔ جن ملکوں میں نوآبادیات بسی ہیں وہا ں سپلائی اور مانگ کا اصول مزدور کے حق میں جاتا ہے۔ اسی لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اجرتوں کا معیار اوروں سے اونچا ہے۔ سرمایہ وہاں سارے جتن کرتا ہے لیکن لیبر کے بازار کو بار بار خالی ہونے سے نہیں روک پاتا کیوں کہ اجرت پر کام کرنے والے برابر مزدوری چھوڑ کر آزادانہ اور خود کفایتی کاشتکار بنتے رہتے ھیں۔ امریکہ والوں میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو مزدوری صرف پاؤں ٹکانے کے لئے کرتے ہیں جسے تھوڑے بہت عرصے بعد بہر حال چھوڑنا ہی ہے۔ نوآبادی میں حالت کے اس بگاڑ کو سنبھالنے کے لئے برطانیہ کی مربیانہ حکومت نے کچھ زمانے کے لئے وہ برتاؤ اختیار کرلیا جسے آج کل کا نوآبادی بسانے کا نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریے کا حاصل یہ کہ نوآبادیات کی زمین کی قیمت خواہ مخواہ بہت بڑھا چڑھا کر رکھی جائے تا کہ مزدور تیزی کے ساتھ آزاد کاشتکار نہ بن بیٹھے۔

اب ذرا پرانے متمدن ملکوں کو لیجئے جہاں پیداوار کے پورے سلسلہ عمل پر سرمایہ حاوی ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر انگلینڈ میں زرعی مزدوریاں 1849 سے 1859 تک کی مدت میں کتنی بڑی ہیں؟ اور نہ اس کے بازار دام۔ ہمارے دوست ویسٹن صاحب بھی انہیں شائد یہی موسرہ دیتے۔ الٹا ہوا یہ کہ قیمتیں گرنے پر انہیں راضی ہونا پڑا۔ یہی مشورہ دیتے۔ الٹا ہوا یہ کہ قیمتیں گرنے پر انہیں راضی ہونا پڑا۔

لیکن ان گیارہ برسوں میں انہوں نے ہر قسم کی مشین لگا دی، زیادہ سائنسی طریقے اپنا لئے، قابل کاشت زمینوں کا ایک حصہ چراگاہوں میں بدل دیا، کھیتوں کے سائز بڑھا دئے اور اسی سے پیداوار کا پیمانہ بڑا کر لیا۔ ان تدبیروں کے علاوہ اور ایسے راستے اختیار کر کے، جن سے لیبر کی قوت پیداوار بڑھا کر اس کی مانگ میں برابر تخفیف کی جا سکے، انہوں نے زرعی آبادی کو پھر اتنا کر لیا کہ وہ بستاً ضرورت سے زیادہ ہی رہے۔ یہ ہے وہ عام طریقہ جس سے پرانے جمے جمائے ملکوں میں اجرتیں بڑھنے کے مقابلے پر سرمایہ ذرا آہستہ یا تیز جواب ی کاروائی کرتا ہے۔ ریکارڈو نے سچ کہا تھا کہ مشین کا لیبر سے مستقل مقابلہ چلتا رہتا ہے اور اکثر مشینیں تبھی لگائی جاتی ہیں جب محنت کی قیمت بڑھ کر ایک حد کو پہنچ چکی ہو۔ (28)۔ لیکن مشین لگانا محنت کی پیداواری قوت بڑھانے کی قو ربہت ساری تدبیروں سے صرف ایک تدبیر ہے۔ یہی ایک قدم جو عام محنت کو نسبتاً فالتو بنا ڈالتا ہے، یہی دوسری طرف ہنر مند لیبت کو سادہ محنت میں بدل کر اس کی قدر و قیمت بھی گرا دیتا ہے۔

یہی قانون دوسری صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔ محنت کی پیداواری طاقت بڑھنے سے، چاہے اجرت کا میعار کچھ زیادہ ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی سرمایہ جمع ہونے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ یہاں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، جیسا کہ آدم سمتھ نے جس کے زمانے مین جدید صنعت ابھی ہاتھ پاؤں نکال رہی تھی، نتیجہ نکالا کہ سرمائے کا تیزی سے جمع ہونا مزدور کے حق میں فیصلہ کرے گا کیونکہ اس کی محنت کی مانگ بڑھتی جائے گی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو آج کل کے بہت سے اہل قلم حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ اگر چہ پچھلے بیس سال کے اندر انگریزی سرمایہ انگریزی آبادی کے مقابلے میں کہیں تیزی سے بڑھا ہے لیکن اجرتوں میں ایسا خاص اضافہ نہیں

ہوا۔ کیوں؟ اس لئے کہ سرمائے کا ذخیرہ ہونا جوں جوں بڑھتا ہے اس کے ساتھ سرمائے کی اندرونی ترکیب بھی رفتہ رفتہ بدلتی جاتی ہے۔ مجموعی سرمائے کا وہ حصہ جو قائم سرمائے میں یعنی مشینری، کچے مال اور ہر ممکن صورت کے ذرائع پیداوار میں لگایا جاتا ہے، وہ درجہ بدرجہ بڑھتا جاتا ہے، بمقابلہ اس حصے کے جو اجرتوں میں یا محنت کی خریداری میں پھیلایا جاتا ہے۔ یہ قانون تھوڑے بہت نپے تلے انداز میں مسٹر بارٹن، ریکارڈو، سسماندی، پروفیسر رچرڈ جونسن، پروفیسر ریمزے، شربولئے اور دوسرے حضرات نے بیان کر دیا ہے۔

اگر سرمائے کے ان دونوں اجزا کی نسبت شروع میں ایک اور ایک تھی تو صنعت کی ترقی میں اب یہ نسبت پانچ اور ایک کی ہو جاتی ہے، اور اسی طرح آگے بھی۔ اگر مجموعی سرمایہ چھ سو لگا ہے اور اس مین تین سو اوزاروں میں، کچے مال وغیرہ میں اور تین سو اجرتوں پر پھیلا ہوا ہے تو مجموعی سرمائے کے صرف دوگنا ہونے کی دیر ہے کہ تین سو کی بجائے چھ سو محنت کرنے والوں کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن اگر چھ سو کے مجموعی سرمائے میں پانچ سو مشین میں، کچے مال اور دوسری چیزوں میں لگا ہے اور صرف سو اجرتوں پر پھیلا ہوا ہے تو سرمائے کو چھ سو سے بڑھ کر تین ہزار چھ سو پر پہنچنا چاہئے تب جا کر تین سو کی بجائے چھ سو محنت کرنے والوں کی مانگ ہو گی۔ لہٰذا صنعت کی ترقی میں لیبر کی مانگ سرمائے کے جمع ہونے کے ساتھ ساتھ قدم نہیں بڑھاتی ہے۔ یہ مانگ بڑھے گی تو ضرور، لیکن سرمائے کے بڑھنے کی رفتار سے برابر اس کا تناسب کم ہوتا جائے گا۔

یہ چند اشارے اتنا دکھانے کو کافی ہیں کہ جدید صنعت کا بڑھنا ہی رفتہ رفتہ محنت کرنے والے کے مقابلے میں سرمایہ دار کا پلہ بھاری کرتا جاتا ہے اور نتیجے میں

سرمایہ داری پیداوار کا عام رجحان یہ نہیں ہوتا کہ اجرت کا اوسط میعار بلند کیا جائے بلکہ یہ میعار تہہ میں اتار دیا جائے، یا محنت کی ویلیو کم و بیش وہیں پہنچائی جائے جہاں اس کی سب سے نیچی حد ہو۔ جب اس نظام کے ہوتے چیزوں کا جھکاؤ یوں ہو تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مزدور طبقے کو چاہئے کہ وہ سرمائے کی دست درازی کا مقابلہ کرنا چھوڑ دے اور اپنی عارضی بہتری کا جو اتفاقی موقع ہاتھ آتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں سے منہ پھیر لے؟ اگر محنت کش ایسا کرنے لگیں تو وہ بے بسی اور بے کسی کا یک انبوہ کثیر ہو کر رہ جائیں گے جس کے سامنے نجات کی کوئی راہ نہ ہو۔ امید ہے کہ میں اب تک یہ دکھا چکا ہوں کہ اجرت کے میعار کی خاطر محنت کشوں کی جدوجہد ایسا فعل ہے جسے اجرتوں کے نظام زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، سو میں سے ننانوے واقعات ایسے ہوتے ہیں جب اجرت بڑھ جانے کے لئے ان کی کوششیں دراصل صرف اس لئے ہوتی ہیں کہ محنت کی مقررہ ویلیو سنبھلی رہے اور یہ کہ سرمایہ دار سے اپنا مول تول کرنے کی ضرورت ان کی اس حالت کی رگ رگ میں بھری ہے جو حالت بکاؤ مال کی طرح ان سے اپنے آپ کو بکواتی ہے۔ اگرچہ بے ہمتی کے مارے سرمائے کے ساتھ اپنے روزانہ کے ٹکراؤ سے منہ موڑ لیں تو پھر ان میں اتنی سکت ہی نہ رہ جائے گی کہ کسی بڑی وسیع تحریک لے کر پہل کر سکیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اجرت پر کام کرنے کا یہ نظام جو محنت کشوں کو عام طور سے دبا کر رکھتا ہے، اس سے قطع نظر، مزدور طبقے کو چاہئے کہ وہ آئے دن کے ان مقابلوں کے آخری انجام کو بہت بڑھا چڑھا کر نہ دیکھے۔ اسے یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ابھی لڑائی صرف اثرات سے چل رہی ہے، ان اثرات کی جڑ میں جو اسباب ہیں، ان سے نہیں چل رہی، وہ نشیب کی طرف ڈھلان کو روک رہی ہے،

لیکن اس کی پوری سمت نہیں بدل رہی، وہ صرف بیماری کو تھامنے کی کوشش میں ہے، اس کا علاج کرنے میں نہیں۔ لہٰذا سرمائے کی انتھک دست درازی کی وجہ سے بازار کی تبدیلیوں کے باعث جو یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر بار اسے چاروناچار چھاپہ مار لڑائی لڑنا پڑتی ہے، اسی میں ڈوب کر نہ رہ جائے۔ اسے یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ موجودہ نظام محنت کشوں پر چاہے کتنی ہی مصیبتیں نازل کر لے لیکن ساتھ ساتھ ایسے مادی حالات اور سماجی صورتوں کو بھی جنم دیتا ہے جو پورے سماج کی معاشی کایا پلٹ کرنے کے لئے لازمی ہیں۔ قدامت پسندی کے اس کلمے کی بجائے کہ "ایمانداری کی محنت کے دن کے بدلے ایمانداری کی مزدوری!" انہیں اپنے پرچم پر یہ انقلابی پلول چڑھا لینی چاہئے کہ "مزدوری پر کام کا نظام مردہ باد!"

اس طول طویل، بلکہ تھکا ڈالنے والے تفصیلی بیان کے بعد، جو مجھے بنیادی سوال پر روشنی ڈالنے کی خاطر مجبوراً دینا پڑا اب میں تقریر ختم کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کرتا ہوں:

1۔ اجرتوں کی شرح کا عام اضافہ عام شرح منافع کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یوں دیکھئے تو مالوں کی قیمتوں پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

2۔ سرمایہ داری پیداوار کا عام رجحان یہی ہے کہ اجرت کا اوسط میعار بڑھائے نہیں بلکہ تہہ تک اتار دے۔

3۔ ٹریڈ یونینیں سرمائے کی دست درازی سے ٹکر لینے کا مرکز بن کر مفید کام انجام دیتی ہیں۔ لیکن وہ اپنی طاقت کا صحیح استعمال نہ کر کے جزوی طور پر نقصان اٹھاتی ہیں۔ عام طور سے ان کی ناکامی اس میں ہے کہ موجودہ نظام کے اثرات کا مقابلہ کرنے میں خود کو صرف چھاپہ مار لڑائی تک محدود کر لیتی ہیں، بجائے اس کے کہ

ساتھ ساتھ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کی جائے، اپنی منظم طاقتوں سے کام لے کر انہیں مزدور طبقے کی آخری رہائی کے لئے یعنی مزدوری پر کام کرنے کے اس نظام کے بالکل خاتمے کے لئے اصلی پرزہ بنالیا جائے۔

مارکس نے آخر مئی اور 27 جون 1860 کے درمیان تحریر کیا۔

نوٹس Notes

1۔ سیاسی معاشیات (پولیٹکل اکانومی) کی تنقید پر کارل مارکس کی تصنیف مارکسی سیاسی معاشیات کے وجود میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب پر قلم اٹھانے سے پہلے مارکس نے پندرہ سال تحقیق اور تلاش میں بسر کئے، بے شمار ادب چھان مارا، تب جاکے وہ اپنے معاشی نظریے کا خاکہ تیار کرنے قابل ہوا۔ شروع میں نیت یہ تھی کہ اپنے تحقیقات کے نتیجے ایک اسی جامع تصریف مین پیش کر دے جو خاص اسی مضمون سے متعلق ہو۔ اگست 1807 میں اس نے اپنے علم ذخیرے کو ترتیب دینا اور پہلا کچا خاکہ پھیلانا شروع کیا۔ چند مہینے گزرے ہوں گے کہ مارکس نے مفصل پلان تیار کرلیا اور فیصلہ کیا کہ اپنی تصنیف الگ الگ اشاعتوں کی صورت میں حصے کر کے شائع کر دے۔ چناچہ برلن کے ایک پبلشر ڈنکر سے ایک ابتدائی معاہدہ کر کے اس نے پہلے مضمون پر کام کا بیڑا اٹھایا اور یہ کتاب جون 1809 میں شائع بھی ہوگئی۔

پہلی اشاعت کے فوراً بعد مارکس نے دوسری کی تیارے کی، جس میں سرمائے کے مسائل سے بحث ہونی تھی۔ لیکن آگے کے مطالعے نے مصنف کو اپنے پہلے والا ارادہ بدل ڈالنے کی راہ سجھائی۔ اب صورت یہ بنی کہ الگ الگ کتاب لکھنے کے بجائے مارکس نے کتاب "سرمایہ" (Capital) لکھ دی جس میں اپنی کتاب

"سیاسی معاشیات کی تنقید پر" کے خاص خاص خیالات بھی نظر ثانی کے بعد شامل کر لئے۔

2۔ یہاں اشارہ ہے اس نامکمل "دیباچہ" کی طرف جو مارکس نے سوچا تھا کہ معاشیات پر اپنے جامع تصنیف کے شروع میں دے گا۔

3۔ Rheinische Zeitung fur Politik, Handel und Gewerbe (سیاست، تجارت اور صنعت کے مسائل پر رائنی اخبار")۔ یہ ایک روزنامہ تھا جو پہلی جنوری 1842 سے 31 مارچ 1843 تک کولون سے مارکس نے اس اخبار میں لکھنا شروع کیا اور اکتوبر میں وہ بھی اس کے اڈیٹروں میں شامل ہوگیا۔

4۔ Allgemeine Zeitung (عام اخبار) یہ ایک رجعت پرست روزنامہ تھا جو 1798 سے شائع ہوا، 1810 سے 1882 تک وہ آگس برگ کے مقام سے چھپتا رہا۔ 1842 میں اس نے ایک مضمون میں یوٹوپیائی (قیاسی) کمیونزم اور سوشلزم کے خیالات توڑ مروڑ کر چھاپے۔ مارکس نے اپنے مضمون "کمیونزم اور آگس برگ Allgemeine Zeitung" میں اس بدعنوانی کا کچا چٹھا پیش کر دیا۔

5۔ Deutsch.Franzosische Jahrbucher (جرمن فرانسیسی سال نامہ) پیرس سے جرمن زبان میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ کارل مارکس اور آرنلڈ روگے اس کے اڈیٹر تھے۔ فروری 1844 میں اس کی ایک ڈبل اشاعت نکلی جس میں مارکس اور اینگلس کی وہ تحریریں شامل تھیں جن تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں مادیت کے فلسفے اور کمیونزم کے نظریے کی طرف کوچ

کرنے کو تیار ہو چکے ہیں۔ سالنامہ اس کے بعد نہیں نکلا اور بڑی وجہ یہ کہ مارکس کے خیالات نے بورژوا ریڈیکل روگے کے خیالات سے میل نہیں کھایا اور اخیلاف نے اشاعت روک دی۔

6۔ جرمن ورکرز سوسائٹی کے بنیاد مارکس اور اینگلز نے اگست 1847 میں بروسیلز میں اس نیت سے رکھی تھی کہ بلجیم میں جو جرمن ورکر بستے ہیں، ان کی سیاسی تعلیم ہو اور ان میں سائنسی کمیونزم کے خیالات کا پرچار کیا جائے۔ ان دونوں رہنماؤں اور ان کے حامیوں کی سرپرستی میں یہ سوسائٹی بلجیم میں جرمن انقلابی پرولتاریہ کو جوڑنے کا ایک قانونی مرکز بن گئی۔ اس کے بہترین کارکن بروسیلز میں کمیونسٹوں کی لیگ میں شامل ہو گئے۔ فروری 1848 میں جب فرانس کا انقلاب برپا ہوا تو بلجیم کی پولیس نے اس سوسائٹی کے ممبروں کو جلاوطن کر دیا اور یوں بروسیلز میں اس جماعت کی سرگرمیاں بکھر کر رہ گئیں۔

7۔ یہاں اشارہ ہے فروری 1848 کے اس انقلاب کی طرف جو فرانس میں برپا ہوا تھا۔

8۔ Neue Rheinische Zeitung. Organ der Demokratie (نیا رائنی اخبار۔ ڈیموکریسی کا ترجمان) جرمن زبان کا روزنامہ تھا جو کولون شہر سے مارکس کی ایڈیٹری میں پہلی جون 1848 سے 19 مئی 1849 تک نکلتا رہا۔ اس کی ادارت میں مارکس کے ساتھ اینگلز بھی شریک تھا۔

9۔ The New York Daily Tribune یہ ایک ترقی پسند بورژوا روزنامہ تھا جو 1841 سے 1924 تک برابر شائع ہوتا رہا۔ مارکس اور اینگلز نے

اس کے کالموں میں اگست 1801 سے مارچ 1862 تک لکھا۔

10۔پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا اجلاس جون 1860 لندن میں ہوا تھا جہاں مارکس نے یہ مقالہ اپنی تقریر کی صورت میں پڑھا تھا مارکس نے پہلی بار اس موقع پر قدرزائد (surplus value) کے اپنے نظریے کی بنیاد مجمع عام میں پیش کی۔اگرچہ اس مقالے کا روئے سخن انٹرنیشنل کے ایک ممبر جان وسٹن کی طرف ہے،جس کا کہنا تھا کہ اجرتیں بڑھوانے سے مزدوروں کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی لہٰذا ٹریڈ یونین سرگرمی کو ورکرز کے مفاد کے خلاف سمجھنا چاہئے،لیکن ساتھ ہی اس مقالے سے مارکس نے پرودھوں اور لاسال، دونوں کے نظریات پر بھی سخت ضرب لگائی،جنہیں مزدوروں کی معاشی جدوجہد اور ٹریڈ یونینوں کی سرگرمی ناگوار تھی۔مارکس نے یہاں اس بات کی ڈٹ کر مخالفت کی ہے کہ مزدوروں کو سرمائے کی لوٹ کھسوٹ کے سامنے بےبسی اور فرمانبرداری سکھائی جائے،وہ نظریے کی بنیاد تیار کرکے بتاتے ہیں کہ مزدوروں کی معاشی جدوجہد کی کیا اہمیت ہے،اس کا کیا رخ ہے اور کیسے اس لڑائی کو پرولتاریوں کے اس مقصد کی پابندی کرنی اور اس منزل کی لگن دینی چاہئے کہ اجرتی محنت (مزدوری) کے اس نام کا ہی صفایا کردیا جائے۔اس تقریر کی اصل عبارت مارکس کے مسودوں میں محفوظ رہ گئی۔پہلی بار 1898 میں لندن میں مارکس کی بیٹی ایلیونورا نے "قدر" قیمت اور منافع" کے عنوان اور اپنے شوہر انگریزی سوشلسٹ ایڈورڈ ایویلینگ کے دیباچے کے ساتھ یہ مقالہ شائع کرایا۔مارکس کے مسودے میں تعارف اور شروع کے چھ بابوں کا کوئی عنوان نہیں تھا۔ایویلینگ نے ان پر عنوان لگائے اور یہاں جس صورت میں شائع کیا جارہا ہے بعینہ اصل کے مطابق ہے،سوائے اس کے کہ مضمون کا نام بدل دیا گیا۔

11۔ انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن (پہلی انٹرنیشنل) یہ پرولتاریوں کی پہلی بین اقوامی جماعت تھی جس کی رہنمائی مارکس اور اینگلس کر رہے تھے (1864-1876) اس جماعت نے بڑے بڑے سرمایہ دار ملکوں کے ترقی یافتہ مزدوروں میں سائنسی سوشلزم کے خیالات پھیلائے اور (لینن کے الفاظ میں) "محنت کشوں کی بین اقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی تاکہ سرمائے پر انقلابی حملے کی تیاری کی جائے"۔ اس انٹرنیشنل کا تفصیلی بیان دیکھنا ہو تو ملاحظہ کیجئے اینگلز کا وہ دیباچہ جو اس نے "کمیونسٹ پارٹی کے مینی فسٹو" کے جرمن ایڈیشن 1890 پر لکھا ہے اور مارکس کا وہ خط، جو اس نے 23 نومبر 1871 کو بولٹے کے نام بھیجا تھا۔

12۔ محنت کشوں نے کام کے دن پر دس گھنٹے روز کی قانونی پابندی لگوانے کے لئے 18 ویں صدی کے آخر میں اور پھر 1830 کے بعد کے برسوں میں جو جدوجہد انگلینڈ میں چھیڑی اس نے پرولتاریوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ 8 جون 1847 کو برطانوی پارلیمنٹ نے بچوں اور عورتوں کے حق میں دس گھنٹے کی پابندی منظور کر لی۔ قانون منظور ہونے پر بھی بہت سے مالکان کارخانہ نے اس پر ایک عرصے تک عمل نہیں کیا۔

13۔ فرنس بورژوا انقلاب 94۔1793 کے زمانے میں جیکو بین کنونشن نے ایک قاعدہ بنایا جس کے مطابق بازار کے بعض سامانوں پر قیمتوں کا کنٹرول کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ اجرتوں کی بھی اونچی سے اونچی حد مقرر کر دی گئی۔

14۔ سائنس کی ترقیوں کی برطانوی سوسائٹی 1831 میں بنی تھی اور آج تک چل رہی ہے۔ مارکس نے یہاں ایک تقریر کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس سوسائٹی کے معاشی بازو کے اجلاس منعقدہ ستمبر 1861، میں ایک شخص ڈبلیو۔ نیومین

(نیو مارچ) نے کی تھی (مارکس نے نام لکھنے میں ذرا سی غلطی کی ہے)۔

15۔ ملاحظہ رابرٹ اووین کے کتاب " کارخانہ داری نظام کے اثر پر کچھ مشاہدے "R. Owen Observations on the Effects of the Manufacturing System.London,1817.

16۔ جنگ کرائمیا کا حوالہ آیا ہے جو 1803 سے 1806 تک چلی۔

17۔ پچھلی صدی کے وسط میں دیہاتی علاقوں کے بہت سارے رہائشی مکان ڈھا دئے گئے۔ اس کی وجہ یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ جاگیرداروں سے جو ٹیکس غریبوں کی بھلائی کے لئے وصول کیا جاتا تھا، وہ بڑی حد تک غریبوں کی اس تعداد کے حساب سے ہوتا تھا جو ان کی زمین جائداد پر آباد ہو۔ جاگیرداروں نے ایسے مکانات، جن کی ضرورت نہ رہ گئی تھی، مگر جن میں دیہات کی زائد آبادی سر چھپانے کی جگہ پاتی تھی، جان بوجھ کر مسمار کرا دئے۔

18۔ سوسائٹی آف آرٹس (Society of Arts)۔ یہ ایک بورژوا تعلیمی اور رفاہ عام کی سوسائٹی تھی جو لندن میں 1854 میں قائم کی گئی۔ یہاں جس تقریر کا حوالہ آیا ہے وہ جان مارٹن کے صاحبزادے جان چارلس مارٹن نے پڑھی ہے۔

19۔ اناج کے قانون کے نام سے انگلینڈ نے قانون بنایا تھا تاکہ باہر ملکوں سے اناج کی درآمد پر پابندی لگائی جائے اور ملکی جاگیرداروں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ 1838 میں مانچسٹر کے مل مالکوں کو بڈین اور برائٹ نے ایک انجمن بنائی "اینٹی کورن لیگ " کے نام سے، مقصد یہ کہ کھلی تجارت کے مطالبے پر زور دیا جائے۔ اس لیگ نے "اناج کے قانون" کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا تاکہ ایک طرف مزدوروں کی اجرت گھٹائی جائے، دوسری طرف جاگیرداروں کی معاشی اور

سیاسی حیثیت گرائی جائے ۔ چنانچہ 1846 میں یہ قانون منسوخ کر دیا گیا جس کے معنی تھے کہ صنعتی بورژوازی نے صاحب جائیداد طبقے پر فتح پائی ۔

20 ۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خانہ جنگی (65-1861) اس میں ایک جانب شمال کی صنعتی ریاستیں تھیں اور دوسری جانب جنوب کی غلاموں سے محنت لینے والے شورش پسندوں کی ریاستیں ۔ انگلینڈ کے مزدور طبقے نے اپنے یہاں کے سرمایہ داروں کے خلاف آواز بلند کی جن کی پالیسی یہ تھی کہ غلاموں والے فریق کی مدد کی جائے ۔ مزدور طبقے نے انگلینڈ کو اس خانہ جنگی میں دخل دینے سے روکا ۔

21 ۔ Physiocrats ۔ فرانس مین اٹھارویں صدی کے وسط میں بورژوا سیاسی معاشیات میں یہ ایک رجحان چلا تھا ۔ اس رجحان کے حامی بڑی سختی سے اس با ت کے حق میں تھے کہ بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ زراعت ہونی چاہئے ، بعض طبقوں کو جو خاص حقوق حاصل ہیں ، ان کا خاتمہ اور حفاظتی محصولات کا خاتمہ ہونا چاہئے ۔ ان لوگوں کو جاگیرداری نظام کے خاتمے کی ضرورت کا پورا احساس تھا لیکن پرامن اصلاحات کے ذریعے اس طرح یہ عمل کرنا چاہتے تھے جس سے حکمراں طبقے اور مطلق العنانی کو کوئی نقصان نہ پہنچے ۔ فزیوکریٹوں کے فلسفیانہ خیالات تقریباً ویسے ہی تھے جیسے اٹھارویں صدی کے فرانسیسی روشن خیال اہل علم کے ۔ اس صدی کے آخر میں جب انقلاب فرانس برپا ہوا تو ان لوگوں کی تجویز کی ہوئی اکثر معاشی اصلاحوں کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ۔

22 ۔ آدم اسمتھ کی تصنیف "فطرت اور قوموں کی دولت کے اسباب کی تحقیق (A.Smith An Inquity into the Nature and Causes of the Wealth of Nations.)

23۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس کے زمانے میں انگلینڈ نے فرانس سے جو جنگیں لڑی تھیں، ان کی طرف اشارہ ہے۔ ان دنوں انگلینڈ میں حکومت نے دہشت کا دور دورہ کر رکھا تھا تا کہ محنت کشوں کی زباں بندی کی جائے، خاص کر عوامی شورشوں کو بے رحمی سے کچلا گیا اور مزدور یونینوں کی ممانعت کے قانون بنائے گئے۔

24۔ مارکس نے یہاں مالتھوس کے اس مشہور پمفلٹ کا حوالہ دیا ہے: " لگان کی فطرت، اس کے بڑھنے کی اور ان اصولوں کی تحقیق، جو لگان کے قانون طے کرتے ہے" (Malthus An Inquiry into the Nature and Progress of Rent , and the Principles by Which it is regulated. London,)

25۔ "محنت گھر" سترھویں صدی کے انگلینڈ میں بنائے گئے تھے۔ 1834 میں جب "قانون مفلسی" جاری ہوئے تو پھر یہ محنت گھر صرف خیرات گھر رہ گئے۔ ان کے قاعدے قانون جیلوں کی طرح اتنے کڑے تھے کہ بعد میں لوگوں نے انہیں "غریبوں کے جیل گھر" کہنا شروع کر دیا۔

26۔ جگن ناتھ۔ ہندو مت میں بھگوان وشنو کا ایک روپ۔ اس مت کے ماننے والوں میں مذہبی جنون اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ رتھ یاترا کے موقع پر بعض لوگ خود کو جگن ناتھ کے بھاری بھرکم رتھ کے نیچے ڈال دیا کرتے تھے اور ایسی موت کو شبھ سمجھتے تھے۔ اب بھی یہ تیوہار بڑے پیمانے پر منایا جاتا ہے۔

27۔ "قانون مفلسی" جو 16ویں صدی کے انگلینڈ میں جاری تھا، اس کے مطابق ہر ایک کھاتے پیتے زمیندار کو غریبوں کی بھلائی کے لئے ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ جو

خاندان اپنی کفالت کے قابل نہ رہتے انہیں خیراتی سوسائٹیوں کے فنڈ سے مالی مدد دی جاتی تھی۔

28۔حوالے کے لیے ملاحظہ ہو ڈیوڈ ریکارڈو کی تصنیف "سیاسی معاشیات اور محصول لگانے کے اصولوں پر" (D.Ricardo On the Principles of Political Economy,and Taxation London,1821,p. 479.)

----------ختم شد----------

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006